نوائے ظفر

(انتخاب کلام بہادر شاہ ظفر)

خلیل الرحمٰن اعظمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔ 1، آر کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 066 110

نوائے ظفر

(انتخاب کلام بہادر شاہ ظفر)

خلیل الرحمن اعظمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔ 1، آر کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 066 110

یہ کتاب پہلی بار انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی سے 1975 میں شائع ہوئی تھی۔

قومی اردو کونسل کی پہلی اشاعت	:	2008
تعداد	:	550
قیمت	:	-/152 روپے
سلسلہ مطبوعات	:	1301

Nawa-e Zafar
compiled by **Khalil-ur-Rahman Azmi**

ISBN : 81-7587-248-9

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

فون نمبر 26103938، 26103381، 26179657، فیکس 26108159

ای۔میل urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ www.urducouncil.nic.in

طابع: میکاف پرنٹرس، 2847، بلیلی خانہ، ترکمان گیٹ، دہلی۔110 006

کاغذ: کھنہ اوپٹما (۷۰ گرام) Khanna Optima 70 G.S.M

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہردلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر علی جاوید
ڈائرکٹر

حرف چند

میں قومی کونسل کی شکر گزار ہوں کہ اس نے خلیل صاحب کی تمام تنقیدی کتابوں کو اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کیا۔ ان میں سے کئی کتابیں ایسی ہیں جن کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ان کتابوں میں شامل بہت سے مضامین شادی کے بعد لکھے ہیں، ان مضامین پر ان کے ادیب دوستوں کو گفتگو اور بحثیں کرتے ہوئے سنا ہے۔ میں ان خطوط کو بھی پڑھتی رہی ہوں جو ایڈیٹروں اور ادیبوں کے خلیل صاحب کے نام آتے تھے۔ ان کی بنیاد پر میں کہہ سکتی ہوں:

(۱) خلیل صاحب نوجوانوں کو ہمیشہ یہ مشورہ دیتے تھے کہ ادب میں کچھ نئی بات وہی کہہ سکتے ہیں یا لکھ سکتے ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ پہلے کیا کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کسی کمرے میں خود کو بند کر کے پوری کوشش سے وہ ریل کا انجن ایجاد کریں جو بہت پہلے ایجاد ہو چکا ہے۔ ان کے بیشتر مضامین کا تعلق شاعری سے ہے۔ قدیم ہو یا نئی اور جدید۔ انھوں نے نیا عہد نامہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ان کی تنقید کو ان کی تخلیقی سرگرمیوں سے الگ کر کے نہیں دیکھنا چاہیے۔

(۲) خلیل صاحب تنقیدی مضامین لکھتے وقت بھی مجھے اس طرح بے چین اور مضطرب نظر آتے تھے جیسے وہ کوئی غزل یا نظم لکھتے وقت نظر آتے تھے۔ بار بار سگریٹ پینا، آنگن میں ٹہلنے لگنا، بار بار آسمان کی طرف دیکھنا، مجھے اب بھی اکثر وہ آنگن میں ٹہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

(۳) خلیل صاحب اپنے دوستوں اور شاگردوں کو ایک بات کی بار بار تاکید کرتے تھے کہ قلم کا استعمال صرف اس وقت کرنا چاہیے جب دل یہ کہے کہ ہم جو لکھنے جا رہے ہیں اس سے پہلے کسی نے نہیں لکھا اور یہ بات اگر اوروں تک نہیں پہنچائی گئی تو ہم جرم کے مرتکب ہوں گے۔

(۴) مصلحت، فائدے کے نقصان اور دنیاوی آسائشوں اور ترقیوں سے بے نیاز ہوئے بغیر تنقید کا منصفانہ کام نہیں کیا جا سکتا۔

(۵) خلیل صاحب عام آدمیوں کی طرح خوش بھی ہوتے تھے اور خفا بھی۔ لیکن ان کو سب سے زیادہ تکلیف اس وقت پہنچتی تھی جب کوئی ان کی نیت پر شک کرتا تھا۔ ان کا قول تھا اگر تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہاری عزت کریں تو سب سے پہلے خود اپنی عزت کرو۔ جو شخص اپنی

عزت نہیں کرتا اس کی کوئی عزت نہیں کرتا۔

(۶) خلیل صاحب جب تک زندہ رہے ایک متنازعہ شخصیت رہے۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ انھوں نے ادب اور ادیبوں کے بارے میں نئے تناظر میں نئی باتیں کہیں۔ یہ بات میں اس لیے نہیں لکھ رہی ہوں کہ وہ میرے شوہر تھے۔ میں نے بہت سے معتبر لوگوں سے ان کے بارے میں یہی رائے سنی ہے۔

(۷) خلیل صاحب ان لوگوں میں تھے جس کا پڑھنا پڑھانا اور ادب جن کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ شاید ہی کوئی دوسرا استاد ایسا ہو جس کی اتفاقی چھٹیاں ضائع ہوئی ہوں۔ ادب اور تدریس کو انھوں نے ساری زندگی کمبل کی طرح اوڑھا بچھایا۔

(۸) خلیل صاحب کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ رشید احمد صدیقی صاحب ان کو چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا کہا کرتے تھے۔ ان کا ملازم سکندر ہر دوسرے تیسرے دن رشید صاحب کا رقعہ لاتا جس میں وہ پوچھتے اس مصرع کا دوسرا مصرع کیا ہے۔ یہ ترکیب اقبال یا غالب نے کس شعر میں استعمال کی ہے۔ فلاں شاعر کا سن وفات یا سن پیدائش کیا ہے۔ مالک رام صاحب نے ہماری زبان میں استفسار کیا کہ غبار خاطر میں مولانا آزاد نے جو مصرعے یا شعر استعمال کیے وہ پورے کیا ہیں اور کس کے ہیں۔ خلیل صاحب نے تقریباً تمام مکمل اشعار اور شاعر کے نام کی نشاندہی کر دی تھی ان باتوں سے ان کتابوں کی اہمیت واضح ہوتی ہے یا نہیں اس کا فیصلہ آپ کریں۔

ان کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی وائس چیرمینی کے زمانے میں شروع ہوا تھا جو چندر بھان خیال وائس چیرمین، ڈاکٹر علی جاوید ڈائریکٹر اور ڈاکٹر ابوبکر عباد (پرنسپل پبلی کیشن آفیسر) کے زمانے میں پائے تکمیل کو پہنچا میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔ اور ڈاکٹر محمد توقیر عالم راہی (قومی کونسل، دہلی) اور عزیزی محمد انصر قاسمی کا بھی شکر گزار ہوں۔ ان کتابوں کی اشاعت میں میرے بیٹے سلمان خلیل نے خاصی دلچسپی لی ہے جو اس کو لینی ہی چاہیے تھی۔ میں قومی کونسل کو خلیل صاحب کی اس کلیات کے جملہ حقوق دیتی ہوں۔

آخر میں کہنا چاہوں گی کہ خلیل صاحب کی بے شمار نثری تحریریں ابھی رسائل میں بکھری ہوئی ہیں کوئی ان کو جمع کر کے کتابی شکل میں شائع کر دے تو کتنا اچھا ہو۔

راشدہ خلیل
اردو باغ، سرسید نگر، علی گڑھ

ترتیب

مقدمہ

ظفر وہ بدنصیب شاعر ہے جس کا کلیات دراصل اس کا مدفن ہے۔ چار دواوین پر مشتمل یہ ضخیم کلام ایک ہفت خواں ہے جس کا سر کرنا ''لانا ہے جوئے شیر کا'' آئندہ اوراق میں اسی کی کوشش کی گئی ہے۔ غالب کے شعروں کے انتخاب نے ''رسوا'' کیا تھا۔ ظفر کا یہ انتخاب ظفر کو ''روشناس کرانے کی ایک عقیدت مندانہ کاوش ہے۔

بہادر شاہ ظفر نے زمانۂ ولی عہدی میں ایک کتاب ''لغت اور اصلاح سخن'' کی تین جلدوں میں لکھ کر ۱۲۲۶ھ میں تمام کی تھی۔ اس کا نام ''تالیفات ابوظفری'' تھا لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ ظفر نے اپنی کتاب ''شرح گلستاں'' کے دیباچے میں ان تین جلدوں کا ذکر کیا ہے۔ ''شرح گلستاں'' ۱۲۵۹ھ میں مطبع سلطانی سے شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب تصوف سے متعلق ہے۔ شیخ سعدی کے اقوال اور حکایات کو سامنے رکھ کر مسئلۂ وحدت الوجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ضمنی طور پر بعض صوفیاء اور مشائخ کے حالات بھی درج کئے ہیں۔ اس کتاب کا تاریخی نام ''خیابانِ تصوف'' ہے اور یہ اب بھی دستیاب ہوتی ہے۔

ظفر کا پہلا دیوان زمانۂ ولی عہدی کی تصنیف ہے۔ اس کا بیشتر حصہ ۱۲۲۳ھ اور ۱۲۲۴ھ میں مرتب ہو چکا تھا۔ لیکن حالات کی ناساعدت کے سبب مدت تک شائع نہ ہو سکا۔ ۱۲۶۱ھ میں پہلی بار مطبع سلطانی واقع قلعہ معلیٰ میں چھپا۔ دیوان کا یہ ایڈیشن نہایت اہتمام سے شائع کیا گیا تھا۔

اس کا ایک نسخہ کتب خانہ ریاست رام پور میں موجود ہے اور اس کے سرورق پر نواب کلب علی خاں والئ رام پور کے دستِ خاص کی یہ تحریر موجود ہے:

''نسخۂ ہذا بتاریخ بستم رجب ۱۲۶۵ھ از جائے بطریقِ تحفہ نزد عاصی محمد کلب علی آمد ہرگز نرفت برہمن۔ سرورے بالاتر از و میکہ ایں نسخۂ بہاریں یافتم''

دوسرا دیوان ۱۲۶۶ھ میں مطبع سلطانی سے شائع ہوا۔ دیوان سوم و چہارم غدر سے کچھ دن پہلے اسی مطبع سے شائع ہوئے۔

غدر کے بعد دیوان دوم کی ایک کاپی لکھنؤ پہنچی اور شیخ قادر بخش مالک مطبع ''اودھ گزٹ'' محلہ حسین گنج نے اسے دوبارہ شائع کیا۔ دیوان اول کا مکمل نسخہ دستیاب نہ ہوسکا۔ اس کے دیوان کی چند غزلیں جو میسر آئیں ''انتخاب لاجواب'' کے عنوان سے اس ایڈیشن میں بطور ضمیمہ شائع کیں۔

سب سے پہلے مطبع مصطفائی دہلی نے ظفر کے چاروں دیوان یکجا کر کے ۱۲۷۰ھ یعنی ۱۸۶۲ میں شائع کیے اسی زمانے میں مطبع احمدی اموجان سے بھی کلیات کا ایک مکمل ایڈیشن شائع ہوا۔ ۱۸۷۰ میں منشی نولکشور نے منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی سے اس کی تصحیح کرائی اور اپنے مطبع سے شائع کیا۔ یہ کلیات اسی مطبع سے کئی بار چھپا اور اس وقت عام طور پر وہی مروج ہے۔

بعض تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ ظفر کا پانچواں دیوان غدر ۱۸۵۷ میں تلف ہوگیا۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ظفر کا بہت سا کلام ایام غدر میں حکیم احسن اللہ خاں نے ضائع کردیا۔

ظفر کا کوئی دیوان ۱۸۴۵ میں مطبع سید الاخبار و مطبع سراج الاخبار سے بھی شائع ہوا تھا۔

''۲۴ر اکتوبر ۱۸۴۵ بادشاہ سلامت کا اردو دیوان مرتب ہوکر مطبع سید الاخبار و سراج الاخبار میں چھپ گیا ہے۔ خط نستعلیق ہے۔ کاغذ ولایتی ہے۔ کل ۶۶ جز ہیں اور ہر صفحہ میں ۱۶ سطریں ہیں۔ چمڑے کی جلد بھی بنائی گئی ہے۔ آٹھ روپے میں فروخت ہوتا ہے۔ صاحبانِ ذوق کلام الملوک، ملوک الکلام کا لطف اٹھانا چاہیں تو دونوں مطبعوں میں سے جس

مطبع سے چاہیں طلب فرمائیں“۔

(بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ، مرتبہ: خواجہ حسن نظامی)

ظفر کے کلیات میں غزلوں کے علاوہ مستزاد، مخمس، مسدس، تضمین، قصائد، نعتیہ، شہر آشوب، دوہے، ہولی، ٹھمری، خیال بھجن، گیت، مرثیہ، سلام، مجرا، سہرا، پنکھا اور قطعات بھی شامل ہیں۔ فارسی، بھاکا اور پنجابی زبان میں بھی متعدد غزلیں اور گیت ہیں۔ کلام کی مقدار اصناف سخن اور تنوع زبان کے اعتبار سے اس دور کا کوئی قادر الکلام استاد بھی ظفر کی اس خصوصیت کو نہیں پہنچتا۔

ظفر کے ان سارے شعری کارناموں پر محمد حسین آزاد مصنف ”آب حیات“ کے قلم کی جولانی نے پانی پھیرنے کی کوشش کی ہے۔ اور انھوں نے ظفر کے متعلق جو بدگمانی پھیلائی وہ آج تک اردو شاعری کے طالب علموں کے لیے ایک مسئلہ بنی رہی ہے۔ وہ آب حیات میں لکھتے ہیں:

> ”بہادر شاہ کے چار دیوان ہیں۔ پہلی کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں اور کچھ کاظم حسین بے قرار کی۔ غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتاپا حضرت مرحوم ذوق کے ہیں۔ جن سنگلاخ زمینوں میں قلم کو چلنا مشکل ہے۔ ان کا نظام اور سرانجام اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمہارا زمین کا بادشاہ ہے۔ طرحیں خوب نکالتا ہے۔ مگر تم سرسبز کرتے ہو ورنہ شورزار بن جائے۔ مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرعہ، کوئی آدھا مصرعہ فقط بحر اور ردیف وقافیہ معلوم ہوجاتا تھا باقی بخیر۔ ذوق ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن وعشق کی پتلیاں بنادیتے تھے“۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> ”وہ (ذوق) اپنی غزل بادشاہ کو سناتے نہ تھے۔ اگر کسی طرح اس تک پہنچ جاتی تو وہ اس غزل پر غزل کہتا تھا۔ اب اگر نئی غزل کہہ کر دیں اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہ نہ تھا۔ ستر برس کا سخن فہم تھا۔ اگر اس سے چست کہیں تو اپنے کہنے کو آپ مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں۔ ناچار

اپنی غزل میں ان کا تخلص ڈال کر دے دیتے تھے"۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"اکثر نئے ایجاد و اختراع ان کے ارادے میں تھے اور بعض بعض ارادے شروع ہوئے مگر ناتمام رہے کیوں کہ بادشاہ کی فرمائشیں دم لینے کی مہلت نہ دیتی تھیں اور تماشا یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا۔ اتنا تھا کہ بات نکالتا مگر اسے سمیٹ نہ سکتا تھا۔ اس کا کیا ہوا انھیں سنبھالنا پڑتا تھا"۔

ایک مقام پر بیان فرماتے ہیں:

"کئی مخمس تھے، کئی رباعیاں تھیں، صدہا تاریخیں تھیں مگر تاریخوں کی کمائی بادشاہ کے حصے میں آئی کیوں کہ بہت بلکہ کل تاریخیں انھیں کی فرمائش سے ہوئیں اور انھیں کے نام سے ہوئیں۔ مرثیہ سلام کہنے کا انھیں موقع نہیں ملا۔ بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ شاہ عالم اور اکبر شاہ کی طرح محرم میں کم سے کم ایک سلام ضرور کہتے تھے۔ شیخ مرحوم بھی اسی کو اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے تھے، ہزاروں گیت، پٹے، ٹھمری ہولیاں کہیں۔ وہ بادشاہ کے نام سے عالم میں مشہور ہوئیں اور ان باتوں میں وہ اپنی شہرت بھی نہ چاہتے تھے۔

آزاد کے ان بیانات کا عام ذہنوں پر جو بھی اثر پڑا ہو لیکن اہل بصیرت نے ہمیشہ انھیں قبول کرنے سے انکار کیا۔ مرزا حیرت دہلوی اپنی کتاب "چراغ دہلی" میں لکھتے ہیں:

"یہ جو مشہور ہے کہ استاد ذوق اشعار کہہ دیا کرتے تھے اور بہادر شاہ اپنے نام سے محفل میں سنا دیا کرتے تھے محض غلط اور بالکل لغو ہے جس کو کچھ بھی شعر گوئی اور شعر فہمی کا مذاق ہوگا وہ سمجھ سکتا ہے کہ ذوق اور ظفر کے رنگ میں زمین اور آسمان کا فرق ہے جب معمولی سے معمولی کنجڑے چھوکرے، بھٹیارے اور قصائی اشعار موزوں کر لیتے تھے تو کیا بہادر شاہ ظفر ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکتے تھے۔ شاعری کے معاملے میں بہادر شاہ کے

متعلق یہ خیال بہت ہی رکیک ہے''۔

مولوی عبدالحق صاحب نے ''چند ہم عصر'' میں اس موضوع پر سرسید کی رائے لکھی ہے:

> ''ایک بار ظفر اور ذوق پر گفتگو چھڑ گئی اور وہی پرانی بحث دہرائی گئی کہ ظفر کے سب دیوان ذوق کے لکھے ہوئے ہیں سید صاحب اس پر چیں بہ جبیں ہوئے اور فرمایا کہ وہ بادشاہ کا کلام تو کیا لکھتا قلعہ کے تعلق سے خود ذوق کو زبان آ گئی''۔

لالہ سری رام دہلوی ''خمخانہ جاوید'' میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا آزاد مؤلف تذکرہ آب حیات استاد پرستی کے والہانہ جوش میں لکھ گئے ہیں کہ ظفر کا جو کچھ کلام ہے وہ سب حضرت ذوق کے فکرِ سخن کا نتیجہ ہے۔ دنیائے اردو اس بے جا ادعا کو نامعتبر قرار دے کر اس کی تردید کر چکی ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ حضرت ذوق کے کلام کا جو رنگ ہے اس سے ظفر کا کلام بالکل الگ ہے''۔

نواب نصیر حسین خیال ''مغل اور اردو'' میں لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر آزاد نے تو عشق ذوق میں بہادر شاہ کے نام اور ان کی شاعری تک کو مٹانا چاہا ہے مگر جنھیں حقیقی طور پر قلعہ معلیٰ اور اس کی وجہ سے اردوئے معلیٰ سے واسطہ رہا ہے وہ اردو کو جانتے اور زبان کو پہچانتے ہیں۔ ظفر اور ذوق کی زبان میں شاہ و گدا کا سا فرق ہے اور کیا کہوں''۔

رام بابو سکسینہ مصنف ''تاریخ ادب اردو'' کی یہ رائے ہے:

> ''یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے استاد ذوق اور غالب ان کو غزلیں لکھ کر دیتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ ان کی چند غزلوں میں ان دونوں کا رنگ پایا جاتا ہے لیکن پھر بھی ظفر کے خود شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں کیوں کہ ان کی بہت سی غزلیں خاص ان کے رنگ کی ہیں''۔

مولانا حسرت موہانی فرماتے ہیں:

> ''ذوق کے کمالِ استادی میں شک نہیں لیکن ساتھ ہی اس کے یہ امر بھی مسلم ہے کہ ان کا کلام پختگی کی طرح درد و تاثیر کی خوبیوں میں بے مثال نہیں قرار پا سکتا چنانچہ یہی اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ ہم ظفر کی پر درد غزلوں کو ذوق کی تصنیف نہیں کہہ سکتے''۔

(اردوئے معلیٰ، جنوری ۱۹۲۰)

نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''ذوق میں ایک چیز اور تھی جسے جوش و خروش کہتے ہیں اور جس کا پورا اظہار ان کے قصائد میں ہوتا ہے ظفر کے کلام میں اس چیز کا پتہ نہیں اور نہ ان کا یہ فطری رنگ تھا اور اسی کو دیکھ کر آزاد کا یہ الزام کہ ظفر کا اکثر کلام ذوق کی فکر کا نتیجہ ہے بالکل اٹھ جاتا ہے''۔ (انتقادیات)

فراق گورکھپوری نے ذوق پر ایک طویل مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے ذوق کو ''پنچایتی شاعر'' کہا ہے یعنی ذوق کی شاعری ان کے شخصی اور داخلی تجربات و کیفیات کا اظہار نہیں ہے بلکہ مروجہ اور رسمی خیالات کا بیان ہے۔ اسی مضمون میں ظفر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ظفر کے کلام میں خلوصِ جذبات، شاعرانہ احساس، سوز و گداز اور دل میں چٹکیاں لینے والی اداسی اور ایک درماندگی کا کیف اور کئی جگہ موسیقیت کا جو عنصر ملتا ہے وہ کل کا کل ظفر کا ہے''۔ (اندازے)

اوپر جو رائیں درج کی گئیں ان میں سے سوائے حسرت اور فراق کے کسی اور شخص نے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ آخر کون سا انداز ہے جس کی بنا پر ہم ظفر کو شاہ نصیر اور ذوق سے الگ کر کے انھیں ایک منفرد شاعرانہ حیثیت دے سکتے ہیں۔ حسرت اور فراق، ظفر کے کلام میں جس سوز و گداز، خلوص، شاعرانہ احساس اور اداسی و درماندگی کا ذکر کرتے ہیں وہ کلیات ظفر کی تمام غزلوں سے مترشح نہیں ہوتی بلکہ کوئی شخص سرسری طور پر ظفر کا دیوان الٹ پلٹ کر دیکھے تو اسے زیادہ تر سنگلاخ زمینوں، مشکل قافیوں، انوکھی ردیفوں اور محاورہ بندی اور زبان دانی والی غزلیں ملیں گی۔ یہی خصوصیت شاہ نصیر اور ذوق کی بھی ہے۔ اور آزاد نے جس نوع کے کلام کو اپنے استاد

سے منسوب کیا ہے اس کے بنیادی عناصر یہی ہیں۔ یہ ہم آگے چل کر عرض کریں گے کہ آزاد جن خصوصیات کو شاعرانہ کمالات سے تعبیر کرتے ہیں ان کی تخلیقِ شعر کے سلسلے میں واقعی کیا اہمیت ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ "کلیاتِ ظفر" میں اسی نوع کے کلام کو ظفر کا اصل سرمایہ سمجھا گیا۔ آزاد کے علاوہ اس دور کے دوسرے تذکرہ نگار اور ناقدین نے بھی ظفر کی ان خصوصیات پر زور دیا ہے اور ان کے کلام کا رشتہ کسی نہ کسی طور پر ذوق ہی سے ملانے کی کوشش کی ہے۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ "گلشنِ بے خار" میں لکھتے ہیں:

"بہ اکثر صفات موصوف و محامد و مکارم معروف در اکثر فنون دست گار ہے شائستہ دارد بایں فن بسیار مالوف است۔ شیخ ابراہیم ذوق از مائدہ نعمتش زلہ رباد وظیفہ خوار است وافکار ایشاں بحک واصلاح او درست وہموار"۔

احمد حسین سحر مصنف "تذکرہ بہارِ بے خزاں" لکھتے ہیں:

"ظفر تخلص مرزا ابوظفر بادشاہ دہلی۔ بہ فن شعر میلے ومناسبتے دارد۔ ابراہیم ذوق از مخصوصان حضرت اوست وافکار ایشاں بہ اصلاح چوں گوہر آمدارند"۔

منشی کریم الدین "طبقاتِ شعرائے ہند" میں لکھتے ہیں:

"شعرا ایسا کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں ان کے برابر کوئی نہیں کہہ سکتا ابراہیم ذوق سے اصلاح لیتے ہیں۔ تیرہ چودہ برس کا عرصہ ہوا کہ تخت نشین ہوئے۔ ابتدا میں ولی عہد تھے۔ ان ایام میں بھی ان کے شعر اچھے ہوتے تھے تمام ہندوستان میں اکثر قوال اور رنڈیاں ان کی غزلیں، گیت اور ٹھمریاں گاتے ہیں"۔

اس کے بعد منشی کریم الدین نے ظفر کا ایک نعتیہ قصیدہ نقل کیا ہے۔

نواب علی حسن خاں "تذکرہ بزمِ سخن" میں لکھتے ہیں:

"گفتارش اگرچہ سادہ و پرکار است۔ اما ہمہ اش خاطر شکار است۔ محاورہ گوئی از آں اوست ومعاملہ بندی زیرِ فرمان او"۔

مولانا حالی ''مقدمہ شعر وشاعری'' میں رائے دیتے ہیں:

''ذوق کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے۔ مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں۔ صفائی سے بہت دور جاپڑتے ہیں۔ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں تازگیٔ خیالات کم پائی جاتی ہے''۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت مصنف ''آب بقا'' میں لکھتے ہیں:

''ظفر کے کلام پر اس اعتبار سے نظر کی جائے کہ اس میں محاورے کس طرح ادا ہوئے ہیں، روزمرہ کیسا ہے، اثر کتنا ہے۔ زبان کس قدر مستند ہے تو ان کا مثل ونظیر آپ کو نہ ملے گا۔ اس لحاظ سے کہ زبان اور محاورات کے تو یہ بادشاہ تھے۔ جو لفظ قلعہ معلیٰ سے نکلتا وہ شعراء کے لیے سند ہوجاتا۔ ہاں پرشکوہ الفاظ مضامین بلند، تراکیب فارسی، مصادر فارسی، حروف روابط فارسی سے ان کا کلام خالی تھا تو اس کی ضرورت بھی اردو کی شاعری میں ایسی نہ تھی اور بعض کے نزدیک تو ایسی شاعری مخل فصاحت ہے''۔

ظفر کے متعلق ان تمام رایوں پر غور وفکر سے کام لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرات بھی جو محمد حسین آزاد کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتے اور ظفر کو حقیقی معنوں میں شاعر اور ان کے کلیات کو انھیں کا زائیدہ فکر سمجھتے ہیں۔ انھیں بھی ظفر کا سارا کلام پڑھ کر اس کے شاعرانہ اور غیر شاعرانہ عناصر کو الگ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ یہ رائیں زیادہ تر رسمی اور اخلاقی طور پر دی گئی ہیں یا ان لوگوں کے سامنے ظفر کی بعض غزلیں صرف ''نمونۂ کلام'' کی حیثیت سے آئی ہیں۔ اس لیے کہ اس زمانے کے تذکروں اور انتخابات کی چھان بین کی جائے تو اس میں ظفر کے بہترین اشعار کا کہیں پتہ بھی نہیں ایسے اشعار جو ایک طرف تو ظفر کے درد وکرب کا موزوں اور مؤثر اظہار ہیں۔ دوسرے ان میں ظفر کا لب ولہجہ اور ان کی آواز اتنی منفرد ہے کہ اس پر نصیر اور ذوق کا کسی طرح

دھوکہ نہیں ہوسکتا۔ یہ سب تذکرے اور انتخابات اپنے دامن میں انھیں اشعار اور غزلیات کو سمیٹے ہوئے ہیں جو شاہ نصیر اور ذوق کی نہ بھی ہوں تو انھیں کی سی معلوم ہوتی ہیں اور ان میں وہی آورد و تصنع، کرتب اور بازی گری اور جذبات و احساسات سے معرا موزوں گوئی ملتی ہے جس کا حقیقی معنوں میں شاعرانہ تخلیق سے کوئی تعلق نہیں۔ لطف تو یہ ہے کہ جن حضرات نے ظفر کی حمایت میں مضامین لکھے ہیں اور آزاد کے الزام کی تردید میں پورا زور قلم پر صرف کر دیا ہے وہ بھی ظفر کی روح تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ یہ حضرت آزاد کی غلط بیانی کے کچھ ثبوت فراہم کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ظفر کی مشاقی، قادر الکلامی، سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی محاورہ بندی اور زبان دانی کی تعریف شروع کر دیتے ہیں۔ اور مثال کے طور پر اکثر و بیشتر غیر شاعرانہ و روایتی اشعار و غزلیات سے کام لیتے ہیں یا ان دو چار اشعار کا حوالہ دینے لگتے ہیں۔ جن میں کہیں تخت و تاج یا تیموری حکومت کا ذکر صاف صاف طریقے پر آ گیا ہے۔ صباح الدین عبدالرحمٰن (بزم تیموریہ) حسن عبداللہ (مصنف ستمبر ۱۹۴۴)، ضیاء الدین برنی (رسالہ اردو جنوری ۱۹۵۴) اور شان الحق حقی (انتخاب ظفر) کی کوششیں اپنی جگہ پر مستحسن ہوتے ہوئے بھی نامکمل سی ہیں اور آزاد کا اعتراض اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ ظفر کا کلام خود اس کا نتیجۂ فکر ہے یا نہیں؟

حافظ محمود خاں شیرانی نے ایک مضمون لکھا تھا ''دیوان ذوق میں مولانا آزاد کے اضافے'' جو ''ہندوستانی'' اور ''نگار'' میں شائع ہو چکا ہے۔ مرحوم نے بڑی تحقیق و جستجو کے بعد اس بات کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ مولانا آزاد نے اپنے استاد کے دیوان میں متعدد غزلیں خود تصنیف کر کے شامل کر دی ہیں۔ شیرانی نے ان غزلوں کے مسودات کے فوٹو شائع کیے ہیں اور ان کے جعلی ہونے کی تصدیق کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''میں یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ مسودے منجملہ دیگر پرانے کاغذات کے حضرت مولانا کی ردی سے جو کچھ سال قبل آتش زدگی سے بچائی گئی تھی دستیاب ہوئے تھے۔ حضرت مولانا کے نبیرہ آغا محمد باقر نے مجھے عنایت کیے ہیں۔ جب یہ کاغذات میرے مطالعے میں آئے تو میرا پہلا خیال یہی ہوا کہ یہ استاد ذوق کے ہاتھ کے مسودے ہیں۔ لیکن سیاہی

اور کاغذ پر غور کرنے سے مجھے اپنی رائے میں بہت جلد ترمیم کرنی پڑی اور معلوم ہو گیا کہ کاغذات مولانا کے اپنے زمانے کے ہیں چھ کاغذات طالب علموں کی کاپیوں سے لیے ہیں۔ دو کاغذ نارتھ ویسٹرن ریلوے کے مطبوعہ فارم پر ہیں۔ ہلکی اودی روشنائی میں مسودے تیار ہوئے ہیں۔ مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ حیران کیا یہ تھی کہ ذوق کی غزلوں کے مسودے حضرت مولانا کے خط میں یہاں کیا کر رہے ہیں۔ آخر مطبوعہ دیوان ذوق میں جو غزلوں کو تلاش کیا اس میں تمام غزلیں بہ تفاوت قلیل مل گئیں ادھر حافظ ویران کے مرتبہ دیوان میں پوری پوری غزلیں تو کجا ان کا ایک شعر تک نظر نہ آیا۔ نہ تذکرہ نگاران سے واقف ہیں۔ آخر یہ رائے قائم کرنی پڑی کہ مولانا نے یہ غزلیں تصنیف کر کے ذوق کے دیوان میں داخل کر دی ہیں۔ اور استاد کے بچپن کے کلام سے انھیں موسوم کر دیا ہے''۔

پروفیسر شیرانی کے اس مضمون سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ دراصل آزاد ''آب حیات'' کی تصنیف کے وقت ایک زبردست الجھن میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اپنے استاد ذوق، سے والہانہ عقیدت کی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ اپنا سارا زورِ قلم ان کی عظمت کا سکہ بٹھانے میں صرف کر دیں اور ان کے سر پر ملک الشعرائی کا تاج رکھ کر یہ ثابت کریں کہ اتنا بڑا شاعر نہ پہلے کبھی پیدا ہوا تھا اور نہ اب پیدا ہونے کی امید ہے۔ لیکن انھوں نے ذوق کے دیوان پر نظر ڈالی ہو گی تو اردو کے مسلم الثبوت اساتذۂ فن کے سامنے ان کا دیوان ہلکا اور حقیر معلوم ہوا ہو گا۔ یہ دیوان ہنگامۂ غدر میں انھوں نے اپنی جان پر کھیل کر دست بردِ زمانہ سے بچایا تھا۔ لیکن اس کے حجم اور ضخامت کو کیا کرتے۔ چنانچہ اس بات کا ذہن میں آنا قرین قیاس ہے کہ خود اس میں اپنی کاوش سے اضافہ کریں لیکن یہ بات بھی حقیقت سے قریب ہے کہ جہاں تک نثر نگاری اور انشا پردازی کا تعلق ہے آزاد کا ذہن بہت زرخیز تھا لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیت برائے نام تھی۔ خود ان کا مجموعہ نظم جو ''نظم آزاد'' کے نام سے شائع ہوا ہے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نثر میں جتنی شادابی و شگفتگی ہے ان کے منظومات اتنے ہی پھیکے سیٹھے ہیں شاعری کے میدان میں ایسا معلوم ہوتا

ہے۔ان کی تخلیقی قوت بروئے کار نہیں آتی۔ دیوان ذوق کی ضخامت کو بڑھانے کے سلسلے میں یہ صورت حال پیش آئی ہوگی۔ پھر ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ وہ یہ کہ ذوق کے طرز اور ان کے انداز میں غزلیں لکھنا اور نئی زمینیں اس طرح نکالنا کہ ان پر ذوق کا دھوکا ہو تقریباً ناممکن تھا۔ آخر سولہ غزلیں تصنیف کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہوں گے کہ یہ کام ان کے بس کا نہیں۔ چنانچہ ان غزلوں کو بچپن کا کلام کہہ کر دیوان میں شامل کر دیا۔ اس مقصد میں ناکامیابی کے بعد ان کی نظر آس پاس پڑی ہوگی تو سب سے پہلے خود ذوق کے شاگرد ظفر کا کلیات نظر آیا ہوگا۔ اسے آزاد نے الٹ پلٹ کر دیکھا ہوگا۔ تو مجموعی طور پر انھیں یہاں ذوق اسکول کی شاعری کے نمونے ملے ہوں گے۔ پھر یہ افسوس بھی ہوا ہوگا کہ شاگرد کا شعری سرمایہ استاد کے سرمائے پر بھاری ہے اور ایسا استاد جسے ''آب حیات'' میں اردو کا ''عظیم شاعر'' ثابت کرنا ہے اور یہ لکھنا ہے کہ ''نظم اردو کا ان پر خاتمہ ہوگیا''۔ آخر کار آزاد نے ظفر کے کلام کو ذوق کے سپرد کر کے اپنے اس مقصد کی تکمیل کی۔

میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ آزاد نے جس قسم کے کلام کو ذوق سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے خود اس کی نوعیت کیا ہے اور اگر وہ کلام کسی شاعر کے کلیات میں موجود ہو تو کیا اس کے لیے سرمایۂ افتخار بن سکتا ہے؟ آزاد نے بار بار اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ بادشاہ ردیف قافیے خوب سوچتا تھا اور نئی نئی اور انوکھی زمینوں کا بادشاہ تھا۔ انھیں زمینوں کو سرسبز کرنے کا کام ذوق کے سپرد تھا۔ اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کی نظر میں ان غزلوں کی بڑی وقعت تھی اور ان کے شعری نقطہ نظر سے اس نوع کی شاعری کمال فن کی دلیل تھی، دوسرے یہ کہ آزاد نے مثال کے طور پر جو شعر 'آب حیات' میں دیئے ہیں اور انھیں ذوق سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے ان کی شعریت اور ان کی ادبی قدر و قیمت پر بھی غور کرنا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ جس شخص کو ذرا بھی شعر کا مذاق ہے اور اسے ادنیٰ درجے کی موزوں گوئی اور لفظی بازی گری کے مقابل حقیقی شاعری اور تخلیقی عناصر کی پرکھ کا سلیقہ ہے۔ وہ اگر ظفر کے کلیات کو پڑھنے کی ہمت کرے اور اس نوع کی غزلیں اس کی نظر سے گزریں تو اسے ظفر سے ایک طرح کی نفرت ہو جائے گی۔ اور یہی فیصلہ دینا ہوگا کہ اس طرح کے کلام کا سچی شاعری سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس طرح کی سپاٹ نگاری اور شعر بازی تضیع اوقات اور بے معنی وقت گزاری سے

زیادہ کچھ نہیں۔ چوں کہ آزاد کی ذہنی تربیت شاہ نصیر اور ذوق کے دبستان میں ہوئی تھی اور اس وقت زوال پذیر ادبی مذاق حقیقی شاعری سے اپنا رشتہ توڑ کر اس قسم کی استادی اور پہلوانی کو فن کا اعجاز سمجھ رہا تھا جس کی بنا پر اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر غالب کو ناقدری کا شکار ہونا پڑا اس لیے اس زمانے میں تو یہ سرمایۂ شعری ظفر یا ذوق کسی کے لیے بھی باعثِ عزت ثابت ہو سکتا تھا اور اسی نقطۂ نظر کی وجہ سے آزاد کو یہ توفیق بھی نہ ہوئی کہ وہ خس و خاشاک کے اس انبار میں اس حصے کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کریں جو ایک طرف تو سچی شاعری کا نمونہ ہے۔ دوسرے اس کا شاہ نصیر اور ذوق کے شعری دبستان سے کوئی علاقہ نہیں۔ ''کلیاتِ ظفر'' کا یہ حصہ آزاد کی دسترس میں نہ آسکا اور نہ اس کا کوئی شعر انھوں نے ذوق کے کلام میں خلط ملط کرنے کی کوشش کی اس لیے ہم اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے مجبور ہیں کہ آزاد نے ظفر کے اس سرمائے کو غصب کرنے کی کوشش نہیں کی ہے جو موجودہ ادبی نقطۂ نظر سے ظفر کے لیے مایہ امتیاز بن سکتا ہے اور جسے اس کوئلے کی کان سے جھاڑ پونچھ کر باہر نکالا جائے اور مناسب طور پر دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا جائے۔ تو اہلِ نظر اسے اپنے سینے سے لگائیں گے اور ظفر کی شاعری زندہ رہنے والی شاعری کہلانے کی مستحق ہوگی۔ اب رہا وہ سرمایہ جسے آزاد نے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا تو اس کی حیثیت سکوں کے اس انبار کی ہے جنھیں زمانے کا مذاق اور شعور کھوٹا ثابت کر چکا ہے۔ یہ سرمایہ ظفر کے لیے باعثِ ننگ ہے اس لیے اب اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اسے ظفر کی ملکیت ثابت کرنے میں وقت صرف کیا جائے۔ بلکہ کوئی محقق اگر یہ ثابت بھی کر دے کہ یہ سارا کلام ذوق ہی کا نتیجہ فکر ہے تو یہ ظفر کے حق میں مفید ہوگا۔ ویسے بھی شاعری کے سلسلے میں اس بد مذاقی کی ذمہ داری شاہ نصیر اور ذوق پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اس لیے ظفر کی پیشانی کا یہ داغ ہمیں انھیں دونوں اساتذہ کے حوالے کر دینا چاہیے۔ ''کلیاتِ ظفر'' سے ہم اس نوع کی غزلوں کے ردیف و قافیے بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔ ان سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ان زمینوں کی ''سرسبزی'' کی کیا حقیقت ہے۔

ہاموں کی پسلیاں	فلاطوں کی پسلیاں
بیمار بشیر	دمدار بشیر
دہن کا بوٹا	ذقن کا بوٹا

صنم چھپا چھپ	قدم چھپا چھپ
فتراک خاص	خوراک خاص
جنگجو مطابق	موبمو مطابق
اعتکاف تنگ	شگاف تنگ
نہنگ کا جوڑا	خدنگ کا جوڑا
کمر میں سلاخ	ابر تر میں سلاخ
کوہکن کی پوٹ	نسترن کی پوٹ
حرم کا چٹ پٹ چٹ	درم کا چٹ پٹ چٹ
کان مروڑ	پہلوان مروڑ
بغل میں بگاڑ	کھرل میں بگاڑ
لتاڑ کے گانٹھ	اکھاڑ کے گانٹھ
دہن میں انگشت	کفن میں انگشت
پلنگ چست	تفنگ چست
رستم کے دانت	ضیغم کے دانت
وحشت علی الخصوص	قد و قامت علی الخصوص
نشست کی آنکھ	بندوبست کی آنکھ
توکل کے پھندے	تامل کے پھندے
چکن کی بوٹی	خط ذقن کی بوٹی
پیوند مزاج	شکر قند مزاج
بادام میں شاخ	انجام میں شاخ
نواڑ میں کاغذ	دراز میں کاغذ
بے یقین کی ہڈیاں	آہوئے چیں کی ہڈیاں
چسپیدہ آنکھ	طرۂ پیچیدہ آنکھ

بدخونگ ہے	بتو تنگ ہے
رباب دودو ہاتھ	بوتراب دودو ہاتھ
گیسوئے مشکناب کا قرص	طباشیر آفتاب کا قرص
ترس چشم مگس	قفسِ چشم مگس
تحریرِ گلوگیر	زلف گرہ گیر گلوگیر
رخسار کی تاریخ	مینار کی تاریخ
ہارون کی ارث	مدفون کی ارث
نخچیر کے پھول	کشتۂ شمشیر کے پھول
فصاد کی گردن	بہزاد کی گردن
دلدار کی گردن	بیمار کی گردن
مغرور کی گردن	زنبور کی گردن
سیارے جھڑے	فوارے جھڑے
بیتاب کے کف	محراب کے کف
ارض وسما کے طبق	قل اعوذ برب الفلق

''کلیات ظفر'' سے خس وخاشاک کا یہ انبار علیحدہ کردیا جائے تو ڈھائی تین سو صفحوں کا ایک خوب صورت سا دیوان نکل آتا ہے۔ اور ایک ایسا مجموعہ جس پر ظفر کی اپنی چھاپ لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں ظفر کی آواز اس کا لب ولہجہ شاہ نصیر اور ذوق کے دبستان سے نہ صرف یہ کہ الگ ہوجاتا ہے بلکہ تغزل، شاعرانہ کیفیات اور جمالیاتی رچاؤ کے اعتبار سے یہ کلام اردو غزل کے اس سرمائے سے قریب آجاتا ہے جس کی آبیاری میر، قائم، یقین، درد، مصحفی، سوز اور آتش جیسے شعرا نے کی اور جن کے کلام کا منتخب حصہ اپنے اندر ایسی تازگی و دلکشی اور تاثیر کا عنصر رکھتا ہے جس کی اپنی دائمی اقدار ہیں۔ اس حصے میں بھی غالب حصہ اس کلام کا ہے جو ظفر کی ''آپ بیتی'' ہے اور اس میں کچھ ایسی نشتریت اور گداز ہیں جو اردو غزل کے سرمائے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ظفر یہاں ایک ایسے شخص کے روپ میں نظر آتا ہے جس کی زندگی کا ایک ایک سانس اپنے غموں کی زنجیر

سے ابھار رہا۔ ظفر کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوز نہاں جلتی ہے

کہنے کو تو ظفر نے اپنی زندگی کے آخری ایام رنگون کے بالا خانے میں گزارے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پوری زندگی ایک طرح کی روحانی کشمکش اور ذہنی جلاوطنی میں گزری۔ ایک مسلسل کچوکے دینے والا عذاب اور ہڈیوں کو پگھلا دینے والا غم اس کی شاعری کا اصل محرک ہے اور اس آگ میں جل کر اس نے جو شعر کہے ہیں وہ ہمارے سامنے ایک زبردست المیہ کردار کو پیش کرتے ہیں۔ جن کی مثال صرف ڈرامائی شاعری پیش کر سکتی ہے۔

اپنی آگ میں جلنے کی یہ کیفیت ظفر کے مزاج کا بنیادی عنصر ہے:

گرمی دل سے ہیں یہ سینہ و پہلو جلتے　　　　که نکلتے مری آنکھوں سے ہیں آنسو جلتے

دل و جاں سوز غم سے پھنکے جاتے ہیں کیا کیجیے　　　　لگی ہے آگ وہ اس خار و خس میں کچھ نہیں چلتی

ہر نفس اس دامن مژگاں کی جنبش سے ظفر　　　　دل میں اک شعلہ سا بھڑکا اور بھڑک کر رہ گیا

طپش دل کو لگے آگ کہ یارب کیا ہے　　　　بعد مردن بھی تہہ خاک نہ آرام دیا

سوز غم فراق سے دل اس طرح جلا　　　　پھر ہو سکا کسی سے نہ ٹھنڈا کسی طرح

آتش دل پہ مرے دامن مژگاں نہ رہا　　　　کہ بجھائی نہیں جانے کی یہ بھڑکانے کے بعد

پھرے ہے پارۂ دل دیدۂ پر آب میں یوں　　　　جلا کے چھوڑ دے جیسے کوئی بھنور میں چراغ

آپ گریہ سے بجھے کیا آتشِ دل اے ظفر　　بلکہ اس سے روز افزوں سوزِ دل ہو تو ہو

اور بھڑکی آتشِ غم اور دل جلنے لگا　　سانس جو ہم ٹھنڈی ٹھنڈی دم بہ دم لینے لگے

بل بے تپ اندوہِ محبت اف رے گرمی داغِ فراق　　دل تھا کیا پہلو میں ہمارے گویا آتش خانہ تھا

ہمسر ہوں میرے نالہ سے کیا نالہ ہائے نے　　اس میں ظفر یہ سوز کہاں اور کہاں گداز

سوزشِ دل کو ہیں کیا خاک بجھاتے میری　　مجھ کو رسوائے جہاں دیدۂ تر کرتے ہیں

عین گریہ میں مرے سینہ و دل ہیں سوزاں　　دیکھو اس شدتِ باراں میں یہ گھر جلتے ہیں

اور زیادہ بھڑکاتے ہو تم تو آگ محبت کی　　سوزشِ دل کو اے اشکو کیا خاک بجھانا سیکھے ہو

وفورِ گریہ نے میرے بچا لیا ورنہ　　جلا چکی تھی مری آہ اشکبار مجھے

گر یہی ہے آہِ آتش بار تو جائے شفق　　خیمۂ افلاک کو آگ اے ظفر لگ جائے گی

نہ ہوئی گریہ سے کم کچھ بھی تری گرمیٔ دل　　بلکہ اک آگ سی اے دیدۂ تر اور لگی

بلا سے خاک ہو جائیں گے جل کر سوزشِ غم سے　　مگر منہ سے نہ اف ہم غم گساروں میں نکالیں گے

پڑے ہیں سوزِ محبت سے دل پہ جتنے داغ　　ستارے اتنے نہ ہوویں گے آسماں کے لیے

جلایا دل کو ہے خون ناب حسرتِ دل نے شراب گرم ہے اس سے ایاغ جلتا ہے

بھڑکی ہے بے طرح یہ ظفر آج دل کی آگ آگے تو شعلہ سا کئی بار اٹھ کے رہ گیا

دیکھنا اک دن جلا کر خاک کر دے گا مجھے کام ہی میرے کبھی سوزِ دروں آ جائے گا

لختِ دل آنسوؤں کی رو میں چلے آتے ہیں کیا تماشا ہے کہ یاں بہتی ہے سیلاب میں آگ

کوہ تک بہہ جائے مثلِ موم سب ہو کر گداز میرے دل کی سی اگر ہو سینۂ خارا میں آگ

وہ دیکھے سوزِ محبت سے دل کے داغ کی لو نہ دیکھی جس نے ہو بھڑکے ہوئے چراغ کی لو

شب اس کی بزم میں کیوں شمع ہو گئی خاموش مگر مری خبرِ سوختن گئی ہوگی

آہ کب سینے سے اے ہم نفساں نکلے ہے دل میں اک آگ سلگتی ہے دھواں نکلے ہے

ظفر کی شاعری کا ایک اور بنیادی عنصر زنداں کی وہ دیوار ہے جس سے ٹکرانے میں اس کے جسم و جان خستہ و فگار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زنجیر میں جکڑ کر اس کے ہونٹوں کو سی دیا گیا ہے اور زنجیر کے جھٹکے اور جھنکار اس کے درد و کرب کا اظہار ہیں اس جھنکار میں اسیری کا بے پناہ غم بھی ہے اور رہائی کے لیے جد و جہد کا حوصلہ بھی۔ اردو کے کسی غزل گو نے زنداں اور زنجیر کو اس تواتر اور تسلسل کے ساتھ بطور علامت کے استعمال نہیں کیا ہے۔

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

ہو چکی فصل بہار اور ترا دیوانہ — حیف صد حیف کہ وابستہ زنجیر رہا

ایسے دیوانے کوئی ٹھہرتے ہیں زنداں میں — پاؤں پڑتی ہے مرے آن کے زنجیر عبث

غل سدا وادیٔ وحشت میں رکھوں گا برپا — اے جنوں دیکھ مرے پاؤں کی زنجیر نہ توڑ

مجھ کو بیعت ہے جنوں سلسلہ مجنوں میں — پاؤں پڑتی ہے مرے دیکھ لے زنجیر ہنوز

دشتِ وحشت کو ارادہ ہے کہ آباد کروں — کھول دے کاش مرے پاؤں کی زنجیر حریف

کہے ہے اور وحشت میری دیوانوں سے زنداں میں — چلو یاں سے کنارے توڑ کر زنجیر کو رکھ دو

ظفر کس طرح کوئے یار میں جاؤں کہ پاؤں میں — مرے ہر ایک موج اشک نے زنجیر ڈالی ہے

برپا نہ کیوں ہو خانۂ زنداں میں روز غل — میرے جنوں سے اب تو سلاسل پہ بن گئی

ہوا ہے فصل گل میں جوش وحشت اس قدر پیدا — کہ ہر موج ہوا پہنے ہوئے زنجیر پھرتی ہے

پھر موسمِ بہار میں برپا ہوا جو غل — کیا وحشیوں کے پاؤں کی زنجیر کھل گئی

پائے کو یاں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں — آتی آوازِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا نکل بھاگے ترے دیوانے زنداں سے کہ ہے — طوق بھی خالی پڑا زنجیر بھی خالی پڑی

اے جنوں توڑ کے زنجیرِ درِ زنداں کو
جی میں ہے کھایئے اب چل کے بیاباں کی ہوا

تیرا دیوانہ جو زنداں سے نہ نکلا اب تک
پڑ گیا پاؤں میں کچھ ایسا ہی زنجیر کا پیچ

نالۂ زنجیر کے غل سے یہ زنداں میں کھلا
آج دیوانوں سے کچھ زنجیر کہتی اور ہے

پڑا جو خانۂ زنداں میں غل خدا جانے
کہ میرے پاؤں کی زنجیر ہل گئی تھی کیوں

سن لو جو ہے خانۂ زنداں میں دیوانوں کا حال
کر کے برپا غل سدا زنجیر کچھ کہتی تو ہے

چھپ سکے زنداں میں دیوانہ ترا کیوں کر کہ ہے
طوق پہچانا ہوا زنجیر پہچانی ہوئی

پابہ زنجیر اور دیوانہ ہے آیا کون سا
یہ نہیں معلوم پر زنداں میں غل برپا تو ہے

نکل کر خانۂ زنجیر سے دیوانگی میں ہم
نہیں ہیں مثلِ آوازِ سلاسل اپنے کہتے ہیں

اے اسیرانِ خانۂ زنجیر
تم نے یاں غل مچا کے کیا پایا

زنجیر اور زنداں سے بھی اہم علامت ظفر کی شاعری میں قفس و آشیاں اور صیاد و عندلیب کی ہے اور اردو غزل کا یہ استعارہ عام طور پر بہت پامال ہے۔ اور بیشتر شعرا نے اسے رسمی اور روایتی طور پر استعمال کیا ہے۔ لیکن ظفر کے یہاں یہ علامت ایک تخلیقی قوت بن جاتی ہے۔ اور اس کا جتنا مؤثر اور جاندار استعمال ظفر کے کلام میں ملتا ہے اس کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس باب میں اردو کا کوئی شاعر ان کا حریف نہیں دراصل ظفر کے یہاں یہ علامت محض غزل کی روایت

یا قافیہ ردیف کی رعایت کی حیثیت سے نہیں آئی ہے بلکہ یہ ان کے لیے ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ ان اشعار میں ظفر نے ایک طرف اپنی مجبوری و بے بسی، بے پروبالی اور درماندگی اور موت وحیات کی اس کشمکش کی مصوری کی ہے جس سے اس کی زندگی عبارت تھی دوسری طرف ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے نام لیواؤں کی اپنے ناموس کے تحفظ کے لیے آخری جدوجہد اور باغیانہ عزم کا مکمل اظہار بھی ۱۸۵۷ کی ناکام جدوجہد کی جب بھی کوئی تاریخ مرتب کی جائے گی اس کے لیے سب سے معتبر اور خالص مواد ظفر کے کلام سے مل سکے گا۔ اس نوع کی شاعری غالب، مومن، ذوق یا شاہ نصیر کے حصے میں نہ تھی اس لیے کہ ظفر ایک طور پر اس تہذیب کہن کا آخری اور مکمل نمائندہ تھا اور اس شکست وریخت کا جتنا گہرا اثر اس کے دل پر پڑ سکتا تھا وہ کسی اور کے لیے ممکن نہ تھا۔ پھر ظفر کو یہ بھی اندازہ تھا کہ اس ابتلا و آزمائش میں اس کا جو انجام ہونے والا ہے وہ انفرادی طور پر کسی شخص یا شاعر کی قسمت میں نہیں۔ چمن تیمور کے آخری عندلیب ہونے کی حیثیت سے یہ دامِ بلا صرف اس کے نصیب میں لکھا گیا تھا۔ ظفر کی شاعری کا یہ حصہ اپنے دور کا مرثیہ بھی ہے اور رزم نامہ بھی ہے۔

قفس میں مجھ کو نہ چین آیا پر فغاں سے مری   تمام رات نہ صیاد کو بھی خواب آیا

ہوائے گل نے جو بھڑکا دیا مجھے صیاد   چمن میں توڑ کے میں وہیں جال کو پہنچا

ہزار حیف کہ بلبل کا صحنِ گلشن میں   نہ چھوڑا ایک بھی صیاد نے نشانی پر

قفس کے چاک میں گل رکھ کے مت اٹھا صیاد   کہ بہر بلبل شیدا ہے یہ چراغ قفس

اسیر کنج قفس ہوں میں اے نوا سنجو   بلا سے میری گر آیا بہار کا موسم

کچھ اسیرانِ قفس میں نہ رہا دم شاید   آتی آواز جو ہے خانۂ صیاد سے کم

اب کہاں ہے طاقتِ پرواز تا بامِ قفس کردیا صیاد نے بے بال و پر میرے تئیں

دے اگر پروانگی صیاد تو دل کھول کر اور بھی دو چار نالے ہم قفس میں کھینچ لیں

اگر باندھیں مرغانِ پربستہ ہمت تو لیں کھول آپس میں مل جل کے پھندے

اے ظفر ہے دیکھ کھٹکا باغباں کا کس قدر باغ میں بلبل کی آج آواز بھی آتی نہیں

بہار آئی اسیرانِ قفس آپس میں کہتے ہیں پھڑک کر توڑنا ہے گر قفس تیار ہو جاؤ

جب پھڑک بھی نہ سکے طاقتِ پرواز کہاں دیے صیاد نے اس صید کے پر کھینچ کے باندھ

قفس کے ٹکڑے ساڑادے جو پھڑکے اے صیاد اگرچہ دم نہیں مرغِ شکستہ بال میں کچھ

نہیں ہے طاقتِ پرواز آہ اے صیاد خدا کرے کہ تو اب وادرِ قفس نہ کرے

ہمصفیرو مری فریاد وفغاں گلشن میں آہ کیا ہوتا جو پاس آکے قفس کے سنتے

رہائی دستِ صیاد جفا پیشہ سے مشکل ہے قفس میں طاہر محبوس لاحاصل پھڑکتا ہے

حسرت اے طاقتِ پرواز کہ ہم اڑ نہ سکے گر کے پھڑکا کیے دیوارِ گلستاں کے تلے

صدمہ آہ سے پھٹ جائے نہ صیاد کا دل اپنی اے ہم نفسو طرزِ فغاں اور ہی ہے

قفس کے ٹکڑے اڑادوں پھڑک پھڑک کر آج
ارادہ میرا اسیرانِ ہم نفس یوں ہے

لگا رہتا ہے تیرا باغ میں اے باغباں کھٹکا
کہاں مرغ چمن شاخ شجر پر جمکے بیٹھے ہے

ابھی ہونے کا نہیں لڑنے کو تیار عدو
پھڑ کے یہ مرغ تو دو چار برس میں پھڑ کے

مر گئے آخر پھڑک کر دام سے چھوٹے نہ ہم
دل کی دل ہی میں تمنائے رہائی رہ گئی

ہم اپنے کنج غم میں نالہ وفریاد کرتے ہیں
ہمیں کیا گر چمن میں چہچہا ہے عندلیبوں کا

ہے گرفتاری تری دولت سے تا قیدِ حیات
جائے گی اپنے تصرف سے نہ جاگیر قفس

باندھے پر صیاد نے ایسے ہم اڑ سکتے نہیں
ہوگا کیا کھڑکی قفس کی اب اگر کھل جائے گی

میں بس میں ہوں صیاد کے وہ دیکھیے مجھ کو
پھڑکا کے تہِ دامِ بلا مار کے چھوڑے

خفا ہوا جو اسیرانِ دام پر صیاد
اکھاڑے چار کے پر اور چار کے کاٹے

ظفر نہیں ہے اگر باغباں کا کچھ کھٹکا
تو آج کیوں ہوئے مرغانِ بوستاں ہیں چپ

کھلے ہے دام کے رشتے کا پیچ کب صیاد
پڑا ہوا ہے یہ تقدیر عندلیب کا پیچ

صیادِ ظلم پیشہ نے کچھ آج بے طرح
کی ہے چھری برائے اسیرانِ دام تیز

ہم چمن میں کہہ رہے ہیں آشیاں اپنا درست ۔۔۔ کرتا ہے صیاد فکرِ دام وتدبیر قفس

ہم صفیرو کہو کیا کیجیے کہ آیا صیاد ۔۔۔ لیکے پھر دام کہ مرغانِ چمن کو پکڑوں

قفس میں ہے کیا فائدہ شور وغل سے ۔۔۔ اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

ہم پھڑک لیں اور بھی صیاد تیرے دام میں ۔۔۔ کوئی دم طاقت ہمارے بال و پر میں اور ہے

جہاں چمن میں نشیمن تھے بلبلوں کے ظفر ۔۔۔ ہزار حیف کہ واں آشیانِ زاغ بنے

صیاد تھا وہ کون سا طائر اسیرِ دام ۔۔۔ ثابت جو تیرے ہاتھ سے پر لیکے اڑ گیا

گرا نشیمن بلبل پہ تو نہ برق اے چرخ ۔۔۔ بلا سے اس سے کوئی آشیانِ زاغ جلا

مرغانِ چمن کرتے ہو کیا چہچہے دیکھو ۔۔۔ وہ دوش پہ صیاد لیے دام ہے آتا

سنتے ہیں باغ میں گری بجلی ۔۔۔ جل گیا ہو نہ آشیاں اپنا

صیاد یہ دعا ہے نہ ہم کو خدا دکھائے ۔۔۔ دام و قفس کوئی ترے دام و قفس کے بعد

ہم پھڑک کر دام کے صیاد دیں ٹکڑے اڑا ۔۔۔ پر ذرا ہم کو ہے اپنے بال و پر کی احتیاط

جو پھڑکے مرغ گرفتار اک ذرا صیاد ۔۔۔ چمن میں توڑ کے یہ تیرے جال کو پہنچے

اے بلبلو اتنا نہ کرو غل کہ مبادا دشمن ہو سوا جان کا صیاد تمہارا

مار ہی ڈالتا صیاد ہمیں پھڑکا کر گر کبھی بھول کے ہم نامِ رہائی لیتے

گر اسیروں کو یونہی صیاد تو پھڑکائے گا تو نکل بھاگیں گے وہ اک دن قفس کو توڑ کر

آزاد کب کرے ہمیں صیاد دیکھیے رہتی ہے آنکھ بابِ قفس پر لگی ہوئی

نہ تنگ کیوں ہمیں صیاد یوں قفس میں کرے۔ خدا کسی کو کسی کے یہاں نہ بس میں کرے

ظفر کی یہ حزنیہ شاعری اپنے اندر جو شدت اور المنا کی رکھتی ہے۔ ممکن ہے بہت دیر تک ہم اس کی تاب نہ لا سکیں۔ کیوں کہ کسی شاعر کے نغمے ہمارے لیے اسی وقت گوارا ہو سکتے ہیں جب ہمیں ان کے اندر اپنے دوسرے حواس کی تسکین کا سامان بھی مل سکے۔ ظفر کی زندگی میں جو المنا کی اور کشمکش تھی اس نے انھیں اس کا موقع تو نہ دیا کہ وہ اس زہرِ غم کو ہضم کر کے ارتفاع حاصل کر سکتے۔ لیکن ظفر نے اس شدت کو کم کرنے کا راستہ ڈھونڈھ نکالا تھا۔ یعنی اپنے جذبات کی گرفت میں رہنے کے بجائے ایک طرح سے انھیں وسعت دینے کی کوشش کی ہے۔ ظفر کو موسیقی اور خطاطی سے لگاؤ تھا ہی، شاعری میں بھی انھوں نے ٹھمری، گیت، بھجن، ہولی وغیرہ کو اپنایا اور ایک طرح سے نرم اور ملائم کیفیات سے اپنے دل پر مرہم رکھنے کی کوشش کی۔ ان کی ہولی:

کیوں مو پر رنگ کی مارو پچکاری
دیکھو کنور جی دوں گی میں گاری

وہ بھجن جس کا پہلا شعر ہے:

جن گلین میں پہلے دیکھیں لوگن کی رنگ رلیاں تھیں
پھر دیکھا تو ان لوگاں بن سونی پڑی وہ گلیاں تھیں

اپنے اندر کس قدر حلاوت رکھتا ہے۔ ظفر کے ان شدید اشعار کو چھوڑ کر جہاں وہ ایک طرح سے جذبات و کیفیات کے نقطۂ عروج پر ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان کی کامیاب غزلوں میں حلاوت، نرمی اور زبان کا رس ہے۔ ظفر کا لب ولہجہ اور ان کی شاعرانہ زبان ذوق کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ بلکہ یہ قلعہ معلّٰی کی دین ہے۔ اور جیسا کہ سرسید کا خیال تھا خود ذوق نے ممکن ہے اس بات میں ظفر سے فائدہ اٹھایا ہو لیکن ذوق بنیادی طور پر ایک واعظانہ شخصیت رکھتے تھے اس لیے باوجود کوشش کے ان کی زبان میں تصنع اور پھیکا پن ہے۔ اور جیسا کہ مولانا حالی نے کہا ہے چوں کہ وہ زیادہ تر مضامین خیالی کے شائق تھے اس لیے ان کے لہجے کا غیر فطری اور مصنوعی ہونا ضروری تھا۔ ظفر کی عام طور پر کامیاب اور شگفتہ غزلوں کو دیکھا جائے تو ان پر اسلوب کے اعتبار سے مصحفی اور آتش کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ مصحفی کے یہاں جو ایک طرح کی لمسیاتی کیفیت، معصومی، لطافت، رنگ، خوشبو اور جذبات کی دھوپ چھاؤں اور آتش کی زبان میں جو تازگی اور شادابی ہے اس کے نشانات ظفر کے یہاں صاف طور پر ملتے ہیں۔ یہ بات اس لیے بھی قرینِ قیاس ہے کہ ظفر نے مصحفی و آتش کی زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور ذوق اور شاہ نصیر کے طرز سے ہٹ کر جہاں انھوں نے یہ روش اختیار کی ہے وہاں ایک طرح سے انھیں اپنا فطری رنگ مل گیا ہے۔ ظفر کے اس نوع کے کلام میں ہلکے اور گہرے ہر طرح کے رنگ ہیں اور ان کی وجہ سے ایک خوش گوار تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ اس اسلوب کی کچھ مثالیں دیکھیے۔

جو آئے ہے تری مژگاں کا ذکر چھیڑے ہے　　مرے لیے ہے ہر ایک نیشتر لیے آتا

نہیں معلوم کہاں آج مچائی ہوئی　　آئے ہے رنگ میں وہ رشکِ گلستاں بھیگا

سوتے تھے چین سے ہم خوابِ عدم میں لیکن　　شورِ ہستی نے ہمیں آہ جگا کے مارا
داد دیجیے ظفر اس غمزۂ پنہانی کی　　جس کو مارا اسے کافر نے جتا کے مارا

رات کس گل کو گلے ہم نے لگایا تھا ظفر　　پیرہن جو عطر کی خوشبو میں ہے ڈوبا

اے ظفر دیکھو اس آہِ رسا نے اپنی　　گنبدِ کہنۂ افلاک کو کیا تھام دیا

جس رات ٹھہری آنے کی اس برق وش کی یاں　　گھر کے مرے چراغ سرِ شام ہنس پڑے

کوچے میں ترے تنہا ہر شب مجھے ہو جانا　　دو چار گھڑی اپنا دل کھول کے رو جانا

دم میں دم میرے نہیں جان نہیں جان کے بیچ　　زلف کیا کہتی ہے جھک جھک کے ترے کان کے بیچ

اے ظفر دل نہ ہو کس طرح سے مضطر بے طرح　　آج اس طرح کا دیکھا ہے طرحدار کہ بس

چمکتی ابر میں ہے برق مے کشو لو جام　　حریف تیغ بکف ہے کرو سپر کی تلاش

ہیہات مثلِ گل نہ کسی رنگ ہو رفو　　دستِ جنوں رکھے ہے گریباں سے اختلاط

لو میں پروانے کی دلسوزی سے بن جوگن شمع　　شب کو جلتی ہے کھڑی کھولے جٹا اور طرف

سنبلستان میں سرِ شام ہوئی مشک افشاں　　لے کے خوشبو ترے گیسوئے معنبر کی ہوا

رو کشی کا کرے کس منھ سے ارادہ شیشہ　　دل سے نازک نہیں دیکھا تو زیادہ شیشہ

روتا ہوں کوٹ کے میں سینہ کو یاد آتا ہے　　ہنستا اس یار کا زانوں پہ مرے مار کے ہاتھ
ابر چاہے ہے کہ ہم چشم ہمارا ہو وے　　آبرو اپنی ہے اب دیدہ خون بار کے ہاتھ

رخ پہ کیا زلف ترے غنچہ دہن چھوٹے ہے　　ہم سینہ بختوں سے آخر کو وطن چھوٹے ہے

تزئین جودی وفا نے تو میرے لہو کی چھینٹ　　بوٹی سی ایک دامنِ قاتل پہ بن گئی

کہوں میں کیا ترے احسانِ تیغ اے قاتل　　کہ زخم زخم کے منھ سے دعا نکلتی ہے

میں اگر بھاگا تو پھر ہرگز نہیں آنے کا ہاتھ　　کہہ دو وحشت سے کہ کیوں چھیڑے ہے دیوانی مجھے

خزاں سے سرخی گلہائے صحنِ باغ اڑی　　مگر نہ رونق دلہائے داغ داغ اڑی
پہنچ گئی نہیں اس گل کی بو جو بلبل کو　　تو کیوں چمن سے وہ یوں ہو کے بے دماغ اڑی

صحبتِ گل ہے فقط بلبل سے کیا بگڑی ہوئی　　آج کل سارے چمن کی ہے ہوا بگڑی ہوئی

ان دنوں جو بن جو ہے ان پر تو کس کس ناز سے　　راہ میں چلتے ہیں وہ اپنی پھبن کو دیکھتے

جو پائی بزم میں ساقی تری جگہ خالی　　بھر آیا دیکھ کے دل ساغر وسبو کی طرف
نہ اس کی بزم میں آنسو بہائیو اے چشم　　نگاہ رکھیو ذرا میری آبرو کی طرف

کیا کسی سے خاک ہوں وحشت میں اب مانوس ہم　　دیکھتے ہیں اپنے سائے کو تو رم کرتے ہیں ہم

بلا سے گر نہیں ہے سایہ بالِ ہما سر پر　　تری دیوار کا سایہ کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیے

شبِ فرقت میں جی اپنا لگتا تھا کہانی میں　　پڑے چپکے سرِ بستر سنا کرتے تو ہم بھی تھے

کبھی لب پر جو ہنسی اپنے ذری آتی ہے　　ساتھ ہی آنکھوں میں گریہ سے تری آتی ہے
آئی پھر فصلِ بہاری جو بھی پھولوں میں　　آج گلشن سے نسیمِ سحری آتی ہے

کوچہ جاناں کے جانے کی نکالی ہے یہ راہ　　خاک ہوکر آپڑے ہیں ہم صبا کی راہ پر

یوں ہوا دل میں مرے یار کا پیکان عزیز　　جس طرح آیا ہو گھر میں کوئی مہمانِ عزیز
ناصحا ہاتھ اٹھا فکرِ رفو سے کہ ہمیں　　دستِ وحشت سے نہیں اپنا گریبانِ عزیز

جوں بوئے گل رفیقِ نسیمِ چمن ہیں ہم　　اے ہم دمو وطن میں غریب الوطن ہیں ہم
یارو نہ روکو عشق میں رونے سے تم ہمیں　　اس سے بجھاتے دل کی کچھ اپنے جلن ہیں ہم

حضرتِ دل بیٹھے ہو گر کام سے بیٹھے رہو　　میرے گھٹنے سے لگے آرام سے بیٹھے رہو

دیکھو کیا میرے دیدۂ خون بار　　آج ہیں گل فشاں ادھر آؤ

غم فرقت سے یہ ہے حال کہ میرا غم خوار　　منھ کو چپکا مرے بادیدۂ تر تکتا ہے
کوئی ٹھہراتا نہیں وصل کی صورت ان سے　　صورت ایک ایک کی ناچار ظفر تکتا ہے

ستم تیرے اٹھائے پر نہ اٹھے اس گلی سے ہم　　زمیں میں نے بھی پکڑی تو نہ پھر اے آسماں پکڑی

پاسکے رمز و کنایہ کوئی کیا اس کے ظفر　　جس کی اک بات میں سو طرح کا پہلو نکلے

کہیں ایسا نہ ہو کھل جائے دل کا راز محفل میں　　ہماری آنکھ پھر اس رونقِ محفل سے ملتی ہے

نہ کیونکہ شوق کی گرمی سے دل کا داغ جلے — وہ کہہ گئے ہیں کہ آئیں گے ہم چراغ جلے

نسیمِ صبح جو سوئے چمن گئی ہوگی — تو بس کے پھولوں میں دلہن سی بن گئی ہوگی

جن پر عنقا کی طرح گوشہ گیری ختم ہے — ان پہ بے دام و قفس گویا اسیری ختم ہے

پڑے جس جا پہ تری زلفِ دوتا کا سایہ — نہ رہے نام کوواں اور بلا کا سایہ

نہ کر خیال کہ آئی گھٹا بہت سی ہے — ابھی تو شیشے میں مے ساقیا بہت سی ہے

چمن میں تا نہ ہو گلچیں گلوں پہ دست دراز — اٹھاتی ہاتھ ہے ہر شاخِ گل دعا کے لیے

تمہارے نقشِ کفِ پا کے بوسے لینے کو — زمیں پہ سایہ کے مانند آفتاب آیا

مہکے ہوئے اٹھتے ہیں خوشبو میں سحر جس شب — ہم لے کے بغل میں اس گلفام کو سوتے ہیں

اب ایک غزل ظفر کی ایسی بھی دیکھتے چلیے جس کی پوری فضا میں مصحفی کے لہجے کی جھنکار ہے:

پہلے تو ہم کو تری عشوہ گری نے مارا — اور اگر اس سے بچے کم نظری نے مارا
خوب پھڑکا تو مجھے کنجِ قفس میں صیاد — شوقِ پرواز سے بے بال و پری نے مارا
ہمسری کا تری رفتار سے جب فتنہ نے — قہقہہ طنز سے ایک کبک دری نے مارا
شفقِ صبح سے ہے غرق نجوں چرخ ظفر — تیر ایسا تری آہ سحری نے مارا

فراق گورکھپوری نے اپنے ایک مضمون میں مصحفی کی ایک خصوصیت پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ اور وہ ہے ترستے کی کیفیت (Tentalizing) یعنی کسی کام کا ہوتے ہوتے رہ جانا۔ یونان کی مائتھالوجی میں ایک دیوتا کی کہانی ہے جسے ایسی جگہ قید کر دیا گیا تھا جس کے ایک طرف پانی کا چشمہ اور دوسری طرف انگور کے خوشے تھے یہ پیاسا دیوتا ان دونوں کی طرف بار بار لپکتا تھا لیکن یہ نعمتیں اس کی دسترس سے باہر تھیں۔ اس دیوتا کا نام تنتالوس (Tentalus) تھا اور یہ اصطلاح وہیں سے لی گئی ہے۔ مصحفی کی یہ شاعرانہ کیفیت ظفر کے یہاں ایک مکمل حقیقت بن گئی ہے۔ اور اس کے کردار کا ایک اہم عنصر۔ اس کیفیت سے متعلق ظفر کے اشعار دیکھیے:

شب کو جو دروازہ کھڑکا اور کھڑک کر رہ گیا
پھر گیا کون آن کر در پر ترے خانہ خراب

تھا جلانا ہی اگر دوریٔ ساقی سے مجھے
تو چراغ درِ میخانہ بنایا ہوتا

اسیرِ قفس اڑ چلے تھے چمن سے
پر اٹھتے ہی پنجرا گرا کھل کے کانٹا

اعتبار اس کی ولا پہلو نشینی کا نہیں
بیٹھ کر پہلو میں وہ تو بارہا چمپت بنا

اڑ کے جاسکتا نہیں تا سرِ دیوار چمن
دامِ صیاد سے چھوٹا بھی تو میں کیا چھوٹا

دل میں ہے اپنے حسرتِ نظارۂ چمن
صیاد رکھ قفس کو ہمارے چمن کے پاس

وہ کارواں کہ جو منزل پہ اپنی جا پہنچا
اسی کے پیچھے رواں صورتِ غبار ہوں میں

پہنچا نہ کبھی قافلے تک آہ عزیزو
مجھ سا بھی جہاں میں کوئی بدنام دکھاؤ

کوچۂ یار سے جاتا ہے نہ دل اور نہ ہم
جا کے پھر آتے ہیں دو چار قدم ساتھ کے ساتھ

حسرت اے طاقتِ پرواز کہ ہم اڑ نہ سکے
گر کے پھڑکا کیے دیوارِ گلستاں کے تلے

کوچہ گردی کی جو کچھ دل میں ہوس باقی ہے
خاک بھی اڑتی مری بعدِ فنا پھرتی ہے

تیری گلی سے جا نہ سکا اٹھ کے یہ نحیف
تھا ایک ناتواں سا غبار اٹھ کے رہ گیا

میری طرف سب تاک رہے ہیں محفل میں ہیں جتنے حریف
ساقی تجھ سے ساغرِ مے میں آنکھ بچا کر کیوں کرلوں

گزر جاتی ہے ساری رات کہتے کہتے ہم کو یہ
اب آتے ہیں اب آتے ہیں اب آتے ہیں

گیا منزل پہ سارا قافلہ اور راہِ غربت میں
ہم آوازِ جرس کی طرح سے تنہا بھٹکتے ہیں

کھلی ہوئی ہیں مری زیرِ خاک بھی آنکھیں
کسی کا آہ یہاں تک ہے انتظار مجھے

لگایا جامِ مے ہونٹوں سے اس نے ہم کو رشک آیا
کہ بوسہ اس کے لب کا اے ظفر لیتے تو ہم لیتے

دیکھ کر سوئے چمن حسرتِ پرواز ہمیں
ہائے کیا کیا دمِ بے بال و پری آتی ہے

دیتا میں ایک جہاں کو بہا سیلِ اشک سے
پر دل میں مرے جوش سا یار اٹھ کے رہ گیا

مہرباں صیاد ہوکر ہوگیا نامہرباں دام سے ہم کو رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

بے بال و پری جانے نہ دے گی کیوں کہ اڑا کر گلشن تک
تو نے مجھے آزاد قفس سے اے صیاد کیا تو ہے

سینے میں اس طرح دل تڑپے ہے تجھ بن اپنا جیسے کہ مرغ وحشی پھڑکے قفس کے اندر

نہ ملا قطرۂ مے دور میں تیرے ساقی خونِ دل بیٹھ رہے اپنا ہی پی کر جی میں

مصحفی اور آتش سے ہٹ کر ظفر کی شاعری میں ہمیں ایک اور لے ملتی ہے۔ جسے ہم درویشانہ لے کہہ سکتے ہیں۔ اس میں کچھ ضبطِ غم، کچھ سوگواری اور کچھ بے نیازی کی ملی جلی کیفیت ہے۔ اس کیفیت کا مکمل رچاؤ تو میر تقی میر کے یہاں ملتا ہے۔ لیکن ظفر نے بھی لمبی بحروں میں اس کیفیت کو سمونے کی خاصی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان غزلوں میں شاعر کا لہجہ ان سادھوؤں اور جوگیوں کا سا ہے جو اپنے غم کو بھلانے کے لیے دیس دیس گھومتے رہتے ہیں۔ یہ لہجہ مومن وغالب کے عجمی لہجے سے ہٹ کر خالص ہندوستانی آہنگ رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں ظفر کی ان غزلوں کو دیکھنا چاہیے۔

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غم عشق تو اپنا رفیق رہا کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

دنیا دارو دنیا چھوڑو دنیا میں بدنامی ہے
اس دنیا کے ترک کیے سے ہوئی نیک انجامی ہے

کسی پردہ نشیں کا ہے شوق لگا کوئی طرب اب ایسی بتا دے مجھے
کہ اٹھا کے وہ پردۂ شرم وحیا ذرا اپنا جمال دکھا دے مجھے

جب تھا ساقی یار ہمارا ہم تھے اور میخانہ تھا
اب وہ کہاں دن کیفیت کے وہ بھی ایک زمانہ تھا

کھولا تو نے راز مرا اے دیدۂ پرنم سارا ہے
ہوگیا واقف حال سے میرے اب تو عالم سارا ہے

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا

یہی کیفیت ظفر کو بھجن کی طرف لے گئی اور وہاں اس کے لہجے میں اور بھی موسیقیت اور نکھار پیدا ہوگیا ہے۔

پیہم اگن نت مو ہے جراوے یا کا بھید کہوں کا سے
پی ہو پاس تو جی ہو ٹھنڈھا اپنی بپتا کہوں وا سے

یہ دنیا ہے اوگھٹ گھاٹی پگ نہ بہت پھیلاؤ جی
اتنا ہی پھیلاؤ کہ جس کے سکھ سے دکھ نا پاؤ جی

بھجن کی صنف سپردگی اور بے قراری سے چل کر سکون کی طرف بڑھنے کی خواہش کی ترجمان ہے۔ یہ سکون اس وقت حاصل ہوتا ہے جب شاعر کو اپنے پر مکمل قابو حاصل ہوجائے۔ اور اپنے مسائل کا عرفان بھی، تا کہ وہ اپنی واردات کو تعیم کی شکل دے سکے۔ 'دوہا' غالباً اس تعیم کے لیے موزوں ترین ذریعہ اظہار ہے۔ ظفر کا ہندی و پنجابی شاعری اور ہندوستانی لہجے کی طرف میلان ایک طرف خود اس کے اپنے مزاج اور کیفیات کے ارتقاء کا پتہ دیتا ہے۔ دوسری طرف خاندانِ تیموریہ کی اس خصوصی روایت کا جس کے زیرِ اثر اکبر و جہانگیر نے یہاں کی تہذیب کو سینے سے لگانے کی کوشش کی۔ ظفر اس ہندوستانی ذہن کا پروردہ ہے جس نے نانک، کبیر، وارث علی شاہ،

تلسی داس، عبدالرحیم خانخاناں، امیر خسرو، رس کھان تا سین اور سدا رنگ جیسے شاعر اور مغنی پیدا کیے۔ جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے قومی تہذیب کو آب و رنگ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اردو کے تمام شعرا عجمی شاعری کی روایتوں کے طلسم میں اسیر تھے۔ ظفر نے اس 'جہانِ دیگر' کی سیر کو بھی اپنا منصب قرار دیا۔ نواب نصیر حسین خیال 'مغل اور اردو' میں لکھتے ہیں۔

> ''دنیا کی تاریخ میں ایسی نظیر ڈھونڈھے نہ ملے گی کہ کوئی حکمرانِ قوم اپنی زبان کو سلام کر کے رعایا کی زبان کو یوں تسلیم کر لے یہ رعایت و مروت اسی خاندان پر ختم ہوگئی''۔

شاید یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ ظفر کا ایک اور تخلص بھی ہے۔ انھوں نے ہندی اور پنجابی زبان کے لیے 'شوق رنگ' کا تخلص اختیار کیا۔ ان کے بھجن اور دوہوں میں عام طور پر یہی تخلص ملتا ہے۔ ہم نے اس انتخاب میں ظفر کے ہندی اور پنجابی دوہوں کو خاص طور پر جگہ دی ہے۔ اردو شاعروں کی غزل زدگی اور نقادوں کی سہل انگاری نے ظفر کی شاعری کے اس خوبصورت ترین حصے کی کبھی بھول کر بھی خبر نہ لی۔ حالاں کہ ظفر کے تجربات و احساسات کا مکمل عرفان اور پختگی یہیں ملتی ہے۔ ظفر نے پنجابی میں جو دوہے کہے ہیں وہ ہندوستانی بول چال سے اس قدر قریب ہیں کہ ان سے مانوس ہونے میں ہمیں اتنی ہی آسانی ہوتی ہے جتنی برج بھاشا اور اودھی سے مانوس ہونے میں۔

آج جب کہ ہندوستان آزاد ہو چکا ہے اور ہمارے فنون اور تہذیبی روایات کو غلامی کی اندھیری رات سے نکل کر دن کی روشنی دیکھنی نصیب ہوئی ہے۔ ہمارا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ ہم اپنے دیس کی مصوری، موسیقی، شاعری اور دیگر فنونِ لطیفہ کے تمام سرمایے کو از سرِ نو کھنگالیں اور اس کے سارے قیمتی عناصر کو اپنے نئے خون میں حل کرنے کی کوشش کریں۔ اعداد و شمار اکٹھا کر کے تاریخ لکھنا اتنا دشوار کام نہیں ہے۔ جتنا تاریخ کے زندہ اور جاندار عناصر کو اپنی شخصیت میں جذب کرنا۔ اس لحاظ سے ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی صدی کے موقع پر بہادر شاہ ظفر کا یہ سرمایہ شعری بڑا موزوں اور بیش قیمت تحفہ ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی
شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دیوانِ اوّل

مژدہ اے دل کہ مرے پاس وہ یار آوے گا
خاکِ پا اس کی بنوں گا وہ سوار آوے گا

اس لیے صید گہِ عشق میں ہم صید بنے
کہ کبھی صید فگن بہرِ شکار آوے گا

دیکھ اے دل تو نہ پی جامِ محبت کی شراب
بے مزہ ہووے گا جس وقت خمار آوے گا

دم لبوں پر ہے مرے آ جو تجھے آنا ہے
مجھ کو کیا گرچہ بس از مرگ ہزار آوے گا

تو جو آئینہ صفت غیر سے ہو جائے گا صاف
تیری جانب سے مرے دل میں غبار آوے گا

لے گیا ایک ہی بار آنے میں دل اپنا ظفر
ہو گا کیا دیکھیے جب وہ کئی بار آوے گا

یار دیرینہ ہے پر زور ہے وہ یار نیا
ہر ستم اس کا نیا اس کا ہے ہر پیار نیا

نئے انداز کا ہے جامِ بلا طرۂ یار
روز ہے ایک نہ ایک اس میں گرفتار نیا

تیری ہاں میں ہے نہیں اور نہیں میں ہے ہاں
تیرا اقرار نیا ہے، تیرا انکار نیا

کیسے بے درد دل آزار کو دل ہم نے دیا
روز ہے درد نیا، روز اک آزار نیا

کیا قیامت ہے ستم گار تری طرزِ خرام
فتنہ ہر گام پہ اٹھا دمِ رفتار نیا

کریں وہ کس کی دوا دیکھتے ہیں روز طبیب
تیرے اس نرگسِ بیمار کا بیمار نیا

پھیرتے اس سے ظفر دل کا جو سودا پھر جائے
ایک موجود ہے اور اس کا خریدار نیا

نہ پوچھو دل کہاں پہنچا کسی کو کیا کہیں پہنچا — جہاں پہنچا نہ کوئی یہ وہیں پہنچا، وہیں پہنچا
کہاں پہنچا ہے دیکھو ہم دمو! پیکِ خیال اپنا — کہ اب تک اس جگہ کوئی فرشتہ بھی نہیں پہنچا
نہ پہنچا تو نہ پہنچا طالبِ دیدار تک اپنے — تری تکتے ہی تکتے راہ وقت واپسیں پہنچا
چھپا خورشیدِ تاباں شرم سے زیرِ زمیں جا کر — مری جو آہ کا شعلہ سرِ چرخِ بریں پہنچا
ظفر دامانِ مژگاں سے ہی ٹپکا چاہے ہے آنسو
اگر پہنچا سکے آنکھوں تلک تو آستیں پہنچا

ہاں فروسوزِ دل اک دم نہ ہوا پر نہ ہوا — اور گریہ سے بڑھا کم نہ ہوا پر نہ ہوا
چارہ گر کی نہیں تقصیر بہت کی تدبیر — کارگر زخم پہ مرہم نہ ہوا پر نہ ہوا
سن کے نالوں کو مرے ہو گئے پتھر پانی — سرِ مژگاں بھی ترا نم نہ ہوا پر نہ ہوا
میری جانب سے پڑی سخت گرہ دل میں ترے — سست پیاں ترا محکم نہ ہوا پر نہ ہوا
رات ہمسایوں نے اٹھ اٹھ کے دعائیں مانگیں — سوزِ نالہ مرا مدھم نہ ہوا پر نہ ہوا
جہد کی صانعِ قدرت نے ولے تیرا سا — کسی مخلوق پہ عالم نہ ہوا پر نہ ہوا
کھلکھلا کے ہنسے گلشن میں ہزاروں غنچے — دل ہمارا خوش وخرم نہ ہوا پر نہ ہوا
اے ظفر دیکھیے عقبیٰ میں ہو کیا حال اپنا
چین دنیا میں تو اک دم نہ ہوا پر نہ ہوا

آیا نہ گر نامہ و پیغام کسی کا — آخر ہے کوئی روز میں یاں کام کسی کا
اس چشم کی گردش سے ہو دل کیوں کہ نہ برباد — گھر چھوڑے ہے کب گردشِ ایام کسی کا
شب ہالۂ مہ رشک سے گردوں پہ نہ نکلا — چھلا جو پڑا دیکھا لبِ بام کسی کا
جو ہے وہ مرے نام سے ہے عشق میں آگاہ
بدنام ظفر ہو نہ غرض نام کسی کا

ہم نے دنیا میں آ کے کیا دیکھا　　دیکھا جو کچھ سو خواب سا دیکھا
ہے تو انسان خاک کا پتلا　　ایک پانی کا بلبلا دیکھا
خوب دیکھا جہاں کے خوباں کو　　ایک تجھ سا نہ دوسرا دیکھا
ایک دم پر ہوا نہ باندھ حباب!　　دم کو دم بھر میں یاں ہوا دیکھا
سامنے اس نگاہ کے دل کو　　ہدفِ ناوکِ قضا دیکھا
نہ ہوئے تیرے خاکِ پا ہم نے　　خاک میں آپ کو ملا دیکھا
اب نہ دیجیے ظفر کسی کو دل
کہ جسے دیکھا بے وفا دیکھا

اٹھا دے پردہ نہیں پردہ میں اٹھا دوں گا　　طپش سے دل کی ابھی عرش تک ہلا دوں گا
نہ ہوتا عشق کا میکش اگر خبر ہوتی　　کہ ایک جام میں دونوں جہاں بھلا دوں گا
میں اس کو دیکھ کے یہ محو ہوں کہ حیراں ہوں　　جو کچھ وہ پوچھے گا مجھ سے جواب کیا دوں گا
یہ دے کے دم مجھے لایا تھا کھینچ جوشِ ظہور　　کہ چل جہاں کا تماشا تجھے دکھا دوں گا
نہ پوچھ مجھ سے ظفر تو مری حقیقتِ حال
اگر کہوں گا ابھی تجھ کو میں رلا دوں گا

تنہائی میں اتنا تو نہ گھبراتا ظفر میں　　دل گرچہ مرے پاس نہ ہوتا کوئی ہوتا

اپنی جانب کو جسے تو نے لبھایا ہوگا　　کوئی اور اس کو سوا تیرے نہ بھایا ہوگا
منہ تھا کیا ماہ کا کوٹھے پہ ترے یوں چڑھتا　　مہر پُرنور نے بھی منہ نہ دکھایا ہوگا
بے خطا تو نہیں ہوتے ہیں ظفر وہ برہم
زلف کو ہاتھ کہیں تو نے لگایا ہوگا

گل سے بھی نازک بدن اس کا ہے لیکن دوستو یہ غضب کیا ہے کہ دل پہلو میں پتھر سا بنا
در پر اس پردہ نشیں کی آہ وقتِ انتظار چشم کا حلقہ ہماری حلقۂ در سا بنا
عشق نے کیا جانیے کیا دل میں بھڑکائی ہے آگ اب جو سینے میں مرے ہر داغ اخگر سا بنا

غمِ دل کس سے کہوں کوئی بھی غمخوار نہیں غم فرقت کے سوا
اور اگر پوچھے کوئی قابلِ اظہار نہیں چپکا رہنا ہے بھلا
زلف کے پیچ سے چھٹ سکتا نہیں کوئی دل اور یہ پیچ پہ پیچ
کون سا دل ہے کہ جو اس میں گرفتار نہیں ہے عجب دامِ بلا
سیکڑوں ہیں جگر افگار ہزاروں دل ریش تیرے ہاتھوں لیکن
پاس تیرے کوئی خنجر کوئی تلوار نہیں ہاں مگر نازو ادا
کیا تری چشمِ سیہ مست کی کیفیت ہے کہ جہاں ہے بدمست
جس کو اب دیکھو وہ بے ہوش ہے ہشیار نہیں اے بتِ ہوش ربا
مر مٹے خاک درِ یار پہ عشاق ظفر کہ جو ہونا ہو سو ہو
اٹھ کے اب جائیں کہاں طاقتِ رفتار نہیں مثلِ نقشِ کفِ پا

دل کا کچھ کام نہ تجھ سے بت پرفن نکلا دوست جانا تھا تجھے جان کا دشمن نکلا
خونِ عاشق کا ہے گلگونہ ترے عارض پر قتل ہونے سے ہمارا ترا جوبن نکلا

اے ظفر نالۂ دل نے مرے کچھ کی تاثیر
گھر سے گھبرا کے جو وہ غیرتِ گلشن نکلا

وادئ مجنوں کی اے لیلیٰ ہے کیا دلکش زمیں اک قدم ہرگز نہ آگے ناقۂ محمل بڑھا
جب ہوئی تجھ کو شباہت اس رخِ پرنور سے مرتبہ پھر اور بھی تیرا مہِ کامل بڑھا

ڈال مت اشکوں کا پردہ دیکھ تو پیشِ نظر — یارِ عینِ وصل میں اے چشم تر چھپ جائے گا
اپنی ہستی پر نہ ہنس اتنا کہ ہستی ہے فنا — دیکھ ہنستے ہنستے ہی تو اے شرر چھپ جائے گا
اور چمکے گا زیادہ شعلۂ سوزِ دروں — زیرِ پنبہ کیا ترا داغِ جگر چھپ جائے گا
زندگی جب تک ہے کوئی عیب دیکھے یا ہنر — ورنہ زیرِ خاک سب عیب و ہنر چھپ جائے گا

نہ ہوس سیرِ چمن کی نہ گلِ تر کی ہوا — سرِ عاشق میں ہے اس سرو سمن بر کی ہوا
زاہد تجھ کو مبارک ہو ہوائے جنت — ہم سلامت رہیں اور کوچہ دلبر کی ہوا
جھومتی آتی ہے کیا مثلِ سیہ مست گھٹا — ساقیا آج تو ہے شیشہ وساغر کی ہوا
سنبلستاں میں سرِ شام ہوئی مشک افشاں — لیکے خوشبو ترے گیسوئے معنبر کی ہوا

داغِ سوزاں کو بجھادے نہ دمِ سرد ظفر
کہ یہ دشمن ہے چراغِ دلِ مضطر کی ہوا

وہ بے حجاب جو کل پی کے یاں شراب آیا — اگرچہ مست تھا میں پر مجھے حجاب آیا
خیال کس کا سمایا ہے دیدہ ودل میں — نہ دن کو چین مجھے اور نہ شب کو خواب آیا
تمہارے نقشِ کفِ پا کے بوسے لینے کو — زمیں پہ سایہ کے مانند آفتاب آیا

ترا سخن ہے ظفر وہ کہ سامنے تیرے
ہوئے خموش سخنور نہ کچھ جواب آیا

قدم رکھے ہے وہی عاشقی کے میداں میں — کہ جو ہتھیلی پہ ہے اپنا سر لیے آتا
ہزار آپ کو وہ کھینچتے ہیں پر ان کو — مرا ہے جذبۂ دل کھینچ کر لیے آتا
جو آئے ہے تری مژگاں کا ذکر چھیڑے ہے — مرے لیے ہے ہر اک نیشتر لیے آتا

بیچ میں پردہ دوئی کا تھا جو حائل اٹھ گیا — ایسا کچھ دیکھا کہ دنیا سے مرا دل اٹھ گیا

ہوں تو میں دیوانہ لیکن ایسی کہہ دیتا ہوں بات
جو کہ بیٹھا پاس میرے ہو کے قائل اٹھ گیا

شمع نے رو رو کے کاٹی رات سولی پر تمام
شب کو جو محفل سے تو اے زیبِ محفل اٹھ گیا

صبا نے آتشِ گل کو چمن میں خوب بھڑکایا
کہیں ایسا نہ ہووے آشیاں جل جائے بلبل کا

کوئی دیوانہ کیا پھر سلسلہ جنبانِ وحشت ہے
سبب کیا ہے الٰہی خانہ زنجیر میں غل کا

میں ہوں عاشق مجھے غم کھانے سے انکار نہیں
کہ ہے غم میری غذا

تو ہے معشوق تجھے غم سے سروکار نہیں
کھائے غم تیری بلا

دل و دیں تیرے حوالے کئے کرتے ہی طلب
اور جو کچھ کہا سب

پھر جو بیزار ہے تو مجھ سے بتا اس کا سبب
میری تقصیر ہے کیا

بھیجے خط سیکڑوں لکھ کر تمھیں ہشیاری سے
بڑی دشواری سے

تم نے بھیجا نہ جواب ایک بھی عیاری سے
یہ بھی قسمت کا لکھا

طلبِ بوسہ پہ کیوں اتنا برا مانتے ہو
ہمیں پہچانتے ہو

دیکھو ہم ہیں وہی جاں باز جنھیں جانتے ہو
کرتے ہیں جان فدا

ہے حیاتِ ابدی گر ہو شہادت حاصل
تیرے ہاتھوں قاتل

تیرے آبِ دم شمشیر کو تیرا بسمل
سمجھے ہے آبِ بقا

کیا کہوں میں ترے اندازو ادا کا عالم
ہے ستم ہائے ستم

دیکھ کر ہوش رہیں کیا کہ نکل جائے گا دم
اے بتِ ہوش ربا

نہ تو تقریر سے ہو اور نہ تحریر سے ہو
اور نہ تدبیر سے ہو

ہم تو کہتے ہیں ظفر جو ہو سو تقدیر سے ہو
ہے یہی بات بجا

رات بھر مجھ کو غمِ یار نے سونے نہ دیا
صبح کو خوفِ شبِ تار نے سونے نہ دیا

شمع کی طرح مجھے رات کٹی سولی پر
چین سے یادِ قدِ یار نے سونے نہ دیا

یہ کراہا ترا بیمار الم درد کے ساتھ　　کسی ہمسایہ کو بیمار نے سونے نہ دیا
اے دل آزار تو سویا کیا آرام سے رات　　مجھے پل بھر بھی دلِ زار نے سونے نہ دیا
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو　　میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا
یاس و غم رنج و تعب میرے ہوئے دشمنِ جاں
اے ظفر شب انھیں دو چار نے سونے نہ دیا

نہ درویشوں کا خرقہ چاہیے نے تاجِ شاہانہ　　مجھے تو ہوش دے اتنا رہوں میں تجھ پہ دیوانا
کتابوں میں دھرا کیا ہے، بہت لکھ لکھ کے دھو ڈالیں　　ہمارے دل پہ نقشِ کالحجر ہے تیرا فرمانا
غنیمت جان جو دم گزرے کیفیت سے گلشن میں　　دیئے جا ساقیٔ پیماں شکن بھر بھر کے پیمانا
کچھ ایسا ہو کہ جس سے منزلِ مقصود کو پہنچوں　　طریق پارسائی ہو وے یا ہو راہِ رندانا
یہ ساری آمد و شد ہے نفس کی آمد و شد پر　　اسی تک آنا جانا ہے نہ پھر جانا نہ پھر آنا
ظفر وہ زاہد بے درد کی ہو حق سے بہتر ہے
کرے گر رند دردِ دل سے ہاو ہوئے مستانا

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا
کہو اس تصورِ یار کو کہوں کیوں نہ خضرِ خجستہ پا
کہ یہی تو دشتِ فراق میں مجھے رہنمائے وصال تھا
مرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں جو یہ دل پر رنج و ملال ہے
وہ جب آ گیا میرے سامنے تو نہ رنج تھا نہ ملال تھا
وہ ہے بے وفا، وہ ہے پر جفا، وہاں لطف کیسا وفا کہاں
فقط اپنا وہم و خیال تھا، یہ خیال امرِ محال تھا

پسِ پردہ سن کے تری صدا مرا شوقِ دید جو بڑھ گیا
مجھے اضطراب کمال تھا، یہی وجد تھا یہی حال تھا
ظفر اس سے چھٹ کے جو جست کی تو یہ جانا ہم نے کہ واقعی
فقط ایک قید خودی کی تھی نہ قفس تھا کوئی نہ جال تھا

بھید دل کا گریہ سے اے چشمِ نم کھل جائے گا — وہ جو ہے پوشیدہ اپنا حالِ غم کھل جائے گا
بولتے جو ہم نہیں منھ سے کچھ اس میں بھید ہے — بولنا اچھا نہیں سارا بھرم کھل جائے گا
عقدۂ دل ہے ہمارا غنچۂ گل تو نہیں — جو یہ تجھ سے اے نسیمِ صبح دم کھل جائے گا
گر اثر ہے شوق میں اپنے تو بن خط کے کھلے — اپنا مضموں ان پہ قاصد یک قلم کھل جائے گا
کتنے ہی چھٹ جائیں گے پابندِ زنجیر بلا — جب کہ تیرا طرۂ پر پیچ وخم ہو جائے گا
اس کے رکنے پر نہ جا پیتے ہی جامِ مے ظفر
دیکھنا باتوں میں وہ کافر صنم کھل جائے گا

کارواں منزل پہ پہنچا اور سارے ہم سفر — مثلِ گردِ کارواں اک میں بچھڑ کر رہ گیا

پھر گیا کون آن کر در پر ترے خانہ خراب — شب کو جو دروزاہ کھڑکا اور کھڑک کر رہ گیا
ہر نفس اس دامنِ مژگاں کی جنبش سے ظفر
دل میں اک شعلہ سا بھڑکا اور بھڑک کر رہ گیا

بلبلو دیکھو چمن میں اتنا — نہ کرو شور کہ صیاد آیا

ظفر کرتے نہیں اظہار ہم سوزِ محبت کو — وگرنہ دل سے ہر دم آہِ آتش بار ہو پیدا

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا، کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اٹھا وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہا پردے میں اب نہ وہ پردہ نشیں کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ترے رخ کے خیال میں کون سے دن اٹھے مجھ پہ نہ فتنۂ روزِ جزا
تری زلف کے دھیان میں کون سی شب مرے سر پہ ہجومِ بلا نہ رہا

ہمیں ساغر بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغ دودم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

کئی روز میں آج وہ مہر لقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا اسے پاسِ حجاب و حیا نہ رہا

ترے خنجر و تیغ کی آبِ رواں ہوئی جب کہ سبیلِ ستم زدگاں
گئے کتنے ہی قافلے خشک زباں کوئی تشنۂ آبِ بقا نہ رہا

مجھے صاف بتائے نگار اگر تو یہ پوچھوں میں رو رو کے خونِ جگر
ملے پانوں سے کس کے ہیں دیدۂ تر کفِ پا پہ جو رنگ حنا نہ رہا

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

قفس میں مجھ کو نہ چین آیا پر فغاں سے مری تمام رات نہ صیاد کو بھی خواب آیا

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لیے گرچہ بنانا تھا مجھے کاش خاکِ درِ جانا نہ بنایا ہوتا
نشہ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو عمر تک تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دلِ صد چاک بنایا تو بلا سے لیکن زلفِ مشکیں کا تری شانہ بنایا ہوتا
صوفیوں کو جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا
تھا جلانا ہی اگر دوریٔ ساقی سے مجھے تو چراغِ درِ میخانہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

شعلہ بلند ہوتے ہی اس رخ کی تاب کا روشن ہوا فلک پہ چراغ آفتاب کا
رو رو کے میرا رازِ نہاں فاش کردیا خانہ خراب ہو جیو چشمِ پرآب کا
جو دیکھتا ہوں دیدۂ بیدار ہی سے میں قائل نہ خواب کا ہوں نہ تعبیرِ خواب کا
پی جانا میرے ہاتھ سے اک بہانہ تھا
منظور تھا اسی کو اٹھانا حجاب کا

نہیں معلوم کہاں آج مچائی ہولی آئے ہے رنگ میں وہ رشکِ گلستاں بھیگا
پاک دنیا سے رہے اہلِ صفا دنیا میں اے ظفر آب میں کب گوہرِ غلطاں بھیگا

اسیرِ قفس اڑ چلے تھے چمن میں پر اٹھتے ہی پنجرا گرا کھل کے کانٹا

ہے زیادہ دم بہ دم بحرِ محبت کا چڑھاؤ پار کیوں کر دیکھیے یہ دل اتر کر جائے گا
جذبہ دل کھینچ ہی لائے گا اس خود کام کو کام اپنا ایک دن یہ اے ظفر کر جائے گا

کہتا ہے مجھ سے پھر دلِ بیتاب چل وہیں
کیا جانے مدعا ہے اب اس مدعی کا کیا

میرے گریہ نے نہ دھویا دل کا میرے ایک داغ
اور دل سے یار کے حرفِ محبت دھو دیا

چاہے دلداری کرے چاہے دل آزاری کرے
اے ظفر اس دلربا کو ہم نے دل اب تو دیا

دل نہ پھرتا تجھ سے گر ہوتی تجھے الفت کی قدر
اب ستمگر باعثِ ناقدر دانی پھر گیا

تنگ تھا وسعت سے جس کی عرصۂ ارض و سما
جی میں کیوں کر اے دلِ آدم سمٹ کر آ گیا

سرو کا کیا منہ جو اس کے قد سے ہمسر ہو سکے
صاف سانچے میں بدن اس سیم تن کا ڈھل گیا

تو آ اس دم کہ ہے وقتِ سحر اے گلبدن ٹھنڈا
زمیں ٹھنڈی ہوا ٹھنڈی مکاں ٹھنڈا چمن ٹھنڈا

خدا جانے سحر کس کی گلی سے یہ ہوا آئی
حباب آسا جو میرا ہو گیا ہے پیرہن ٹھنڈا

ہوا کیوں ایک شب کے واسطے پرواز سے سرکش
سحر ہو جائے گا اے شعلۂ شمعِ لگن ٹھنڈا

چلے ہیں رات کو چوری سے ہم اس ماہ کے گھر میں
چراغِ ماہ کو کر دے تو اے چرخِ کہن ٹھنڈا

کہے تھی شب تہہ گلگیر شمع رو رو کر
وبالِ سر پہ مرے تاج زر بنایا تھا

لگے ہے سیرِ گلشن میں دل اے غنچہ دہن کس کا
ترے فرقت کے مارے کو روش کس کی چمن کس کا

تصور میں ہمیشہ جس کے اپنے دل سے لڑتا ہوں
خدا جانے نظر میں کھب رہا ہے بانکپن کس کا

زمیں سے تا فلک برپا جو اک طوفانِ آتش ہے
شرر انگیز ہے نالہ بہ عزمِ سوختن کس کا

عزیزو جانِ شیریں دی ہے کس نے عشقِ شیریں میں
زبانِ تیشہ پر مذکور ہو جز کوہ کن کس کا

ہوچکی فصلِ بہار اور ترا دیوانہ — حیف صد حیف کہ وابستۂ زنجیر رہا

شب رہا تھا کہیں ہے چشم جو مخمور تری — باتیں جھوٹی نہ بس اب ہم سے گل اندام بنا

خاک ہوکر بھی بگولے کی طرح چین نہیں — حال ابتر ہے یہ کچھ تیرے ہوا خواہوں کا

آج دل محتسب شہر کا میخانے میں — سنتے ہی دور سے آوازۂ قلقل ٹوٹا

کیا تو ضبطِ فغاں رات ہم نشیں لیکن — عجب ہے دل پہ مرے اختیار کا ہونا

جلا جی نہ دل مفت لے کر کسی کا — کہاں بھی تو مان اے ستمگر کسی کا
نہ کیوں تنگ ہو کشمکش سے قفس میں — نہ باقی رہا ایک شہپر کسی کا
بھلا ہوے کس رو سے اب غنچہ روکش — کہاں منھ ہے اس کے برابر کسی کا
دل اس کا ملے کس طرح میرے دل سے — کہ بس کب چلے ہے کسی پر کسی کا
کیا حالِ دل اس سے کریں اظہار کسی کا — سنتا ہی نہیں ذکر وہ زنہار کسی کا
گر ہم ہیں گنہگار تو کر خاک کا پیوند — پردہ نہ اٹھا چرخ ستمگار کسی کا
جوں آئینہ اب حسرتِ دیدار سے تیرے — رہتا ہے کھلا دیدۂ خوں بار کسی کا
ہاں تو بھی خبر برق صفت آن کے لینا — پہلو میں تڑپتا ہے دل زار کسی کا

میری جانب سے غیروں نے لگایا کچھ نہ کچھ ہوگا — نہ آیا وہ تو اس کے دل میں آیا کچھ نہ کچھ ہوگا
لڑے ہیں میکدے میں آج جو یوں شیشہ و ساغر — کرشمہ چشم ساقی نے دکھایا کچھ نہ کچھ ہوگا[1]

---

[1] یوں شیشہ و ساغر ٹکرائیں سر پیٹ کے میکش رہ جائیں — اس فن کو جہاں میں اور کوئی جز ساقیٔ دانا کیا جانے
(اقبال احمد سہیل)

سنا میں نے کئی ان کی بھی ساری رات آنکھوں میں　　کسی نے میرا افسانہ سنایا کچھ نہ کچھ ہوگا
بتاں کرتے تو ہیں ظلم و ستم پر چاہتا ہوں میں　　کبھی انصاف بھی اس کا خدایا کچھ نہ کچھ ہوگا

غیر کا کس لیے یاں شکوۂ بیجا کیجیے　　اپنے قابو میں نہیں دل ہی ظفر ہے اپنا

کشمکش سے یہ اسیروں کو وہ ٹوٹا کہ ظفر　　رشتۂ دام کو صیاد نے پھر کر گانٹھا

توڑ زنجیر کو دیوانہ نہ بھاگا ہو کہیں　　دیکھو غل ہے پڑا خانۂ زنداں میں کیا

اعتبار اس کی دلا پہلو نشینی کا نہیں　　بیٹھ کر پہلو میں وہ تو بارہا چمپت بنا

تسمہ تسمہ کر دیا بس کاٹ کر عاشق کی کھال　　وہ فرنگی زادہ کلکتہ جو سیکھا ناپنا

دل کو سمجھائے مرے کہہ دے یہ ناصح سے کوئی　　ہم کو کیا مشفق من آن کے سمجھایئے گا
جب کہا میں نے کہ تم تو ہو کوئی آتش خو　　تو وہ کہنے لگے ہاں آپ نہ جل جایئے گا

سوتے تھے چین سے ہم خوابِ عدم میں لیکن　　شورِ ہستی نے ہمیں آہ جگا کے مارا
داد دیجیے ظفر اس غمزۂ پنہانی کی　　جس کو مارا اسے کافر نے جتا کے مارا

تو جو مہتابی پہ کل رات کھڑا گاتا تھا　　دائرہ مہ بھی لیے ساتھ کیے جاتا تھا
بندھ گئی تھی یہ ہوا گانے کی تیرے کہ مرا　　ساتھ ہر تان کے جی تھا کہ اڑا جاتا تھا
کیا کہوں رقص کا عالم عجب انداز کے ساتھ　　ساتھ ٹھوکر کے تری ٹھوکریں دل کھاتا تھا
ہاتھ کو ہاتھ پہ تو رکھ کے لگا جب چلنے　　ہاتھ ہم ملتے تھے دل تھا کہ ملا جاتا تھا

آنکھ چاہت کی ظفر کوئی بھلا چھپتی ہے　　اس سے شرماتے تھے ہم، ہم سے وہ شرماتا تھا

رات کس گل کو گلے ہم نے لگایا تھا ظفر　　پیرہن جو عطر کی خوشبو میں ہے ڈوبا ہوا

خاک رو رو کے کرے جی کوئی اپنا خالی　　لاکھ حسرت سے ہمارا دلِ محزوں ہے بھرا

جو نہ کہنا تھا کہا جھٹ منہ پہ اس سفاک کے　　سچ تو یوں ہے ہاں ظفر بھی ایک ہی بیباک تھا

گلی گلی تری خاطر بھرا یہ چشمِ پُرآب　　لگا کے تجھ سے دل اپنا بہت خراب ہوا

ہمیشہ کرتے رہے غیر کی طرفداری　　کبھی نہ آپ نے اک حرف منصفی سے کہا
بھر آئے چشمِ اجل میں بھی یک بیک آنسو　　تمہارے کشتہ نے کچھ ایسا بیکسی سے کہا
ظفر وہ دشمن جاں ہے اسے نہ جانو دوست
ترے جتانے کو ہم نے یہ دوستی سے کہا

اے یاس والم جاؤ مرے خانۂ دل سے　　مہمان کوئی اب تو یہاں اور ہے آتا
بولے وہ ظفر غیر سے سن کر مری فریاد　　لو آج تو اک گرمِ فغاں اور ہے آتا

دیکھیے صبح تری کون سے دن ہوتی ہے　　میں تو مرنے کے قریب اے شبِ ہجراں پہنچا

عجب ہے سوزِ محبت سے دل مرا ٹھہرا　　کہیں بھی آگ پہ سیماب ہے بھلا ٹھہرا
یہ کس کی چشم کی گردش نے اس کو دی گردش　　کہ آسمان نہ گردش سے اک ذرا ٹھہرا
گئی نہ مر کے بھی میرے نصیب کی گردش　　کہ سنگِ قبر مرا سنگ آسیا ٹھہرا

ہر ایک دیکھ کے صورت کو میری ہنستا ہے — الٰہی میں کوئی دیوارِ قہقہا ٹھہرا
صفائی کیا کہوں میں اس کے روئے سادہ کی — ظفر یہ پائے نگہ جس پہ ہے ذرا ٹھہرا

تم نے کیا نہ یاد کبھی بھول کر ہمیں — ہم نے تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا دیا

سر پر سلطنت پر بیٹھتے آتا ہے ننگ اس کو — ترے کوچے سے ہے جو خاکسار اٹھا ہوا آتا

خواہ وہ داغ جنوں تھا خواہ کوئی اشکِ خوں — ہم نے سر آنکھوں پر رکھا عشق تو نے جو دیا
اب دل آزاری کرے وہ خواہ دلداری کرے — اے ظفر اس دلربا کو ہم نے دل اب تو دیا

اڑ کے جا سکتا نہیں تا سرِ دیوارِ چمن — دامِ صیاد سے چھوٹا بھی تو میں کیا چھوٹا
مل گئی ہیں خاک میں ہیہات کیا کیا صورتیں — چشمِ نقشِ پا کو مثلِ آئینہ حیراں کیا

چاہیے اس کا تصور ہی سے نقشہ کھینچنا — دیکھ کر تصویر کو تصویر پھر کھینچی تو کیا

اعتبارِ صبر وطاقت خاک میں رکھوں ظفر — فوجِ ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

گرتا تھا ظفر رات کو وہ نشۂ مے سے — پر میں نے اسے ہو کے ہم آغوش سنبھالا

ہمارا شیشۂ دل گر کے تیرے ہاتھوں سے — ہزار حیف ہے محفل کے درمیاں ٹوٹا

خاک آرام مرے دل کو دل آرام دیا — دل لیا ایک تو اور دوسرے الزام دیا
طپشِ دل کو لگے آگ کہ یارب کیا ہے — بعدِ مردن بھی تہہ خاک نہ آرام دیا

خم کے خم پی گئے یارانِ سیوکش لیکن
ہم کو اس دور میں ساقی نے نہ اک جام دیا
اے ظفر دیکھیو اس آہِ رسا نے اپنی
گنبدِ کہنۂ افلاک کو کیا تھام دیا

یوں تو جانا تمھیں منظور جہاں ہوجانا
پر جو آنا ہو ادھر سے تو یہاں ہوجانا
دوستی کے ہیں سب انداز تمہارے معلوم
پر کہیں تم نہ مرے دشمنِ جاں ہوجانا
دے دیا ہم نے دل اس جانِ جہاں کو اپنا
تھا نصیبوں میں جو رسوائے جہاں ہوجانا
یوں تو پروانہ بھی جل جائے ہے پر مشکل ہے
عشق میں میری طرح سوختہ جاں ہوجانا

لے جاؤ جی اگر تم بیٹھے ہو دے کے دھرنا
پر کوئے دوستی میں ہاں پھر قدم نہ دھرنا
ملنا نہ تو عدو سے ہم کو پڑے گا مرنا
ایسا ستم نہ کرنا ظالم خدا سے ڈرنا
جاتی تو ہے گلی میں اس غیرتِ چمن کی
برباد خاک میری پر اے صبا نہ کرنا
جب تک نہ کشتئ مے ہاتھ آئے اپنے ساقی
دریائے رنج و غم سے ہو پار کب اترنا
بحرِ جہاں میں غافل ہستی پر ایک دم کی
مثلِ حباب دریا کیا چاہیے ابھرنا
کیا کیا ہوا پریشاں دل اے ظفر ہمارا
یاد آیا اس کے رُخ پر زلف کا بکھرنا

جب کھلکھلا کے ساقیٔ گلفام ہنس پڑا
شیشے نے قہقہے کیے اور جام ہنس پڑا
تھا غنچہ دل گرفتہ نہایت ہی باغ میں
پر کچھ دیا صبا نے جو پیغام ہنس پڑا
جس رات ٹھہری آنے کی اس برق وش کی یاں
گھر کا مرے چراغ سرِ شام ہنس پڑا
کیا بات یاد آگئی اس کو کہ اے ظفر
وہ یک بیک جو سن کے مرا نام ہنس پڑا

کوچے میں ترے تنہا ہر شب مجھے ہوجانا
دو چار گھڑی اپنا دل کھول کے رو جانا
وہ تم سے ملے جس کی تقدیر میں جلنا ہو
دل دے کے تمھیں ہم نے اے شعلہ رُخو جانا
کہتے ہو کہ جاتا ہوں مانع نہیں میں لیکن
احوال جو ہے میرا تم دیکھ تو لو جانا

زنجیر بپا دیکھا جب موج سے جوہر کی — دیوانہ ترا ہم نے پھر آئینہ کو جانا
اے بے خبرو دنیا یہ مزرعِ عقبیٰ ہے — جز تخمِ نکوئی تم کچھ اور نہ بو جانا
نیند آئے ظفر کیونکر یاد آئے جو شب مجھ کو — سر رکھ کے سرِ زانو اس یار کے سو جانا

ہوائے گل نے جو بھڑکا دیا مجھے صیاد — چمن میں توڑ کے میں وہیں جال کو پہنچا

مرا تو حال ہونا آپ کی فرقت میں یوں ہی تھا — مجھے شکوہ نہیں تم سے مری قسمت میں یوں ہی تھا
رقیب اشفاق پر ان کے اگر نازاں ہیں ہونے دو — کہ ان کا ڈھنگ ہم سے بھی نئی شفقت میں یوں ہی تھا
اڑائی خاک ہم نے خوب تھی مجنوں کو کیا طاقت — کہ وہ تو آ گیا اس وادیٔ وحشت میں یوں ہی تھا
تم اچھے وقت آ پہنچے وگرنہ ہم تو مر جاتے — ارادہ ہو چکا اپنا غمِ فرقت میں یوں ہی تھا
دکھا کر غیر کو صورت مجھے کیوں رشک سے مارا — کہ میں تو مر رہا دیدار کی حسرت میں یوں ہی تھا

ظفر تم دیکھتے ہو جس طرح آئینہ کو حیراں!
کل ان کو دیکھ کر میں بھی رہا حیرت میں یوں ہی تھا

جو نہ ہونا تھا ہوا ہم پر تمہارے عشق میں — تم نے اتنا بھی نہ پوچھا کیا ہوا کیوں کر ہوا

کھائے گا ہم کو کہاں تک فرقتِ جاناں کا غم — دیکھ لینا کھاتے کھاتے غم کا منھ پھر جائے گا

کوچۂ جاناں میں جانا ہی پڑے گا ہو سو ہو — کیا کروں بیتاب دل پھر اے ظفر ہونے لگا

ظفر اس شمع رو کی لگ رہی ہے لو ہمیں ہر دم — چراغِ صبح کب داغِ دلِ بیتاب سا دمکا

دیکھ صیاد اسیروں کو نہ بھڑکا اپنے — خوں فشانی سے کریں گے قفس دوام خراب

کیا ہم سے کیا نباہ کیا خوب — صد آفریں ان کو واہ کیا خوب
آئے نہ قرار پر وہ شب کو — تا صبح دکھائی راہ کیا خوب
کیا کیا نہ ستم دکھائے تو نے — اے عشقِ ستم پناہ کیا خوب
گاہے نہ کہا ظفر کو لاؤ — بس دیکھی تمہاری چاہ کیا خوب

عارض پہ تیرے ہو عرق افشاں کبھی جو زلف — پھر جائے یک بیک سرِ ملکِ فرنگ آب

شراب خود نہیں معیوب ساقیا لیکن — بُروں کے پینے سے ہے لگ گیا شراب کو عیب

کوئی لگ جائے اترتے ہوئے شاید ٹھوکر — اس تمنا میں پڑے ہیں تیرے زینے کے قریب

صبح محشر بھی ہوئی اور نہ کھلی آنکھ مری — دیکھیے پاؤں کہاں تک ابھی پھیلائے ہے خواب

آپ کو پہنچائیں واں تک اس میں ہونی ہو سو ہو — آج ہم بھی آزمائیں اے دلِ مضطر نصیب
مت اٹھا آسودگانِ خاک کو اے روز حشر — اک ذرا راحت ہوئی ہے ان کو مر مر کر نصیب

نکلتے شعلے جو ہیں ساتھ آہ کے ہر دم — یہ آگ دل میں تمھیں نے لگائی ہے صاحب

اٹھ کے پہلو سے ہمارے جس طرف جائینگے آپ — مثلِ سایہ آپ کے ہمراہ ہم آئیں گے آپ
مجھ کو سمجھائیں گے یا میرے دلِ دیوانہ کو — حضرتِ ناصح سے پوچھو کس کو سمجھائیں گے آپ
آپ کی خاطر سے ہم کرتے تھے ضبطِ اضطراب — دیکھ کر بیتاب ہم کو اور گھبرائیں گے آپ
دل الجھ کر زلف میں کوئی سلجھتا ہے ظفر
اور الجھے گا زیادہ جتنا سلجھائیں گے آپ

اس چمن میں کیا کہیں کیوں کر ہوا پھر جائے ہے
جوں صبا ہم پھونک پھونک اپنے قدم دھرتے ہیں آپ

ہے ابھی رات کہاں جائے ہے اے ماہ لقا
بول اٹھتا ہے یوں ہی مرغ سحر آپ سے آپ
دل سے ہے راہ اگر دل کو تو ہو جائے گی
بے خبر تجھ کو محبت کی خبر آپ سے آپ

مدت کے بعد حضرتِ ناصح کرم کیا
فرمائیے مزاجِ مقدس کی بات چیت
پر ترکِ عشق کے لیے ارشاد کچھ نہ ہو
میں کیا کروں نہیں یہ مرے بس کی بات چیت

آفریں آپ کے سونے کو نہ جاگے اور ہم
پس دیوار رہے گرمِ فغاں ساری رات

ایسے دیوانے کوئی ٹھہرتے ہیں زنداں میں
پاؤں پڑتی ہے مرے آن کے زنجیر عبث

مثالِ نقشِ قدم آہ اٹھ نہیں سکتا
ملا یا خاک میں تو نے شکستہ پائی آج

آپ کا چوری سے جانا کھل گیا شاید ظفر
آج چرچا ہو رہا تھا ان کے گھر والوں کے بیچ

دم میں دم میرے نہیں، جان نہیں جان کے بیچ
زلف کیا کہتی ہے جھک جھک کر ترے کان کے بیچ
وہ نہ آیا ہے نہ آئے گا، بلا سے اس کی
کوئی مر جائے اگر حسرت و ارمان کے بیچ
عرش سے فرش تلک جو ہے وہ سب ہے اس میں
دیکھ وسعت ہے ظفر کیا دلِ انسان کے بیچ

مر جائیے نہ ہو جیے منت کشِ مسیح
اب تو یہی ہے اس ترے بیمار کی صلاح

خود رفتگاں کو روکے کوئی کیا کسی طرح چل نکلے پر قدم نہیں تھمتا کسی طرح
سوزِ غم فراق سے دل اس طرح جلا پھر ہوسکا کسی سے نہ ٹھنڈا کسی طرح
میں خاک ہو کے عشق میں برباد ہوگیا دامن تلک پر اس کے نہ پہنچا کسی طرح

قدر اے عشق رہے گی تیری کیا میرے بعد کہ تجھے کوئی نہیں پوچھنے کا میرے بعد
درِ جاناں سے میری خاک نہ کرنا برباد دیکھ جانا نہ ادھر بادِ صبا میرے بعد

آتشِ دل پہ مرے دامنِ مژگاں نہ رہا کہ بجھائی نہیں جانے کی یہ بھڑکانے کے بعد

حسرت ہے اس اسیر قفس پر کہ جس کے پر اڑتے پھرے ہیں بعدِ فنا بھی چمن کے گرد

یا قتل کروایا مجھے تم دار پہ کھینچو اب آگے تمہارے یہ گنہگار ہے موجود

میکدے میں عشق کے جو لوگ ہیں کافر تو ہیں لیکن ان کے کفر میں اندازِ دین داری ہے اور

جو عرش سے ہے فرش تلک سب اسی میں ہے دیکھ آنکھ کھول کر
کیا کیا نہیں ہے اس میں کہ سب کچھ اسی میں ہے پر چاہیے نظر
دل اپنا پہلے زنگِ کدورت سے صاف کر مانندِ آئینہ
پھر تو بغور دیکھ کہ اس آئینہ میں ہے کیا حسن جلوہ گر
پیدا نگاہ کر کہ تجلیٔ حسن یار سب چاہیے آشکار
شعلہ سے طور کے نہیں کم روشنی میں ہے پر سنگ کا شرر
کیوں کعبہ دکنشت میں سر مارتا ہے تو سرگرمِ جستجو
تو جس کو ڈھونڈتا ہے چھپا وہ تجھی میں ہے پر تو ہے بے خبر

جوشِ بہار حسن سے کس گل کے اے صبا   ہے یہ جنوں کا جوش
مصروف اس قدر جو گریباں دری میں ہے   ہر غنچۂ سحر
ہے دور جام وصحبتِ یارانِ زندہ دل   کیفیت حباب
کچھ ہے اگر مزا تو یہی زندگی میں ہے   باقی ہے درد سر
ہے خود پرست پوچھتا کیا ہے خدا کی راہ   ہے وہ بہت قریب
گم کردہ راہ آپ تو اپنی خودی میں ہے   اس سے ہے دور تر
صد داغ سوزِ عشق سے کھا بلکہ صد ہزار   ہر داغِ دل پہ تو
لذت تجھے نصیب اگر عاشقی میں ہے   اے سوختہ جگر
افشائے رازِ عشق نہ کر کہہ کے جی کی بات   پردہ ہی خوب ہے
جی ہی میں اپنے رہنے دے جو کچھ کہ جی میں ہے   خاموش اے ظفر

یا تو وہ رکھتے تھے سرگوشی ہمیں سے اس قدر   یا لگی ہونے سخن پوشی ہمیں سے اس قدر
یاں نہ لو اک جرعہ غیروں میں اڑاؤ خم کے خم   واہ وا انکارِ مے نوشی ہمیں سے اس قدر
جوں گل و بلبل چمن میں سب ہیں ہنستے بولتے   سیکھی اک غنچہ نے خاموشی ہمیں سے اس قدر
چشم وا ہیں حسرتِ دیدار میں مدت سے ہم   اے تصور واہ رو پوشی ہمیں سے اس قدر
نکہتِ گل جو سفر کرتی ہے بے رختِ سفر   اے ظفر سیکھی سبکدوشی ہمیں سے اس قدر

شعلۂ شمعِ لگن یوں ہے فروزاں شب کو   خوشنما ٹوپی پہ جوں ہوتے ہیں انگریز کے پر
ہزار حیف کہ بلبل کا صحنِ گلشن میں   نہ چھوڑا ایک بھی صیاد نے نشانی پر

برنگ غنچہ نہ کھلوا مرے لب اظہار   مبادا تجھ کو کرے حرف مدعا دلگیر

ترا گھر میرا کاشانہ تھا اب ہے غیر کا مسکن   تسلط زاغ نے پایا ہما کے آشیانے پر

غل سدا وادیِ وحشت میں رکھوں گا برپا   اے جنوں دیکھ مرے پاؤں کی زنجیر نہ توڑ

خاک اب آئینہ میں دیکھوں میں اپنی صورت   میری نظروں میں پھرے ہے تری تصویر ہنوز
مجھ کو بیعت ہے جنوں سلسلۂ مجنوں میں   پاؤں پڑتی ہے مرے دیکھ لے زنجیر ہنوز

شعر کے رمز سے گر تو نہیں واقف ہے ظفر   سیکھ لے تو سخنِ حافظِ شیراز سے رمز

نہ روک تو ہمیں جانے دے تجھ کو کیا ناصح   بلا سے راہِ محبت اگر ہے دور دراز

دل میں ہے اپنے حسرتِ نظارۂ چمن   صیاد رکھ قفس کو ہمارے چمن کے پاس

قفس کے چاک میں گل رکھ کے مت اٹھا صیاد   کہ بہر بلبل شیدا ہے یہ چراغ قفس

اے ظفر دل نہ ہو کس طرح سے مضطر بے طرح   آج اس طرح کا دیکھا ہے طرحدار کہ بس[1]

اک میں بھی ترے دور میں ہوں رندِ سبوکش   تو مجھ کو نہ کر ساقیِ گلفام فراموش
واعظا قولِ قیامت سے ڈراتا ہے مجھے   یاد میں اس فتنہ گر کی کس کو ہے محشر کا ہوش

بدن پہ عاشقِ وحشی کے خاک کافی ہے   جنوں کے جوش میں کس کو ہے پیرہن کا ہوش
چمن ہے گریۂ خونیں سے تختۂ دامن   وگرنہ کس کو ہے نظارۂ چمن کا ہوش

---

[1] نہ ہوا ہائے یقیں ورنہ دوا نہ ہوتا   آج اس طرح کا دیکھا ہے پری زاد کہ بس

انعام اللہ خاں یقین

چمکتی ابر میں ہے برق میکشو لو جام　　حریف تیغ بکف ہے کرو سپر کی تلاش

ہم نے کی ہے جاں کنی اور اس نے کی خاراکنی　　واجبی ہے گر کریں ہم کوہ کن پر اعتراض

ہیہات مثلِ گل نہ کسی رنگ ہو رفو　　دستِ جنوں رکھے ہے گریباں سے اختلاط

لحاظ ہے یہ فقط تیری دوستی کا ہمیں　　جو تیری بزم میں کرتے ہیں ہم عدو کا لحاظ

موجِ دودِ شمع مت اس کو سمجھیو اہلِ بزم　　کھیلتی ہے رات کو اپنے سرِ کاکل سے شمع
آہِ آتش بار کیا نکلے دلِ پرداغ سے　　ہم نے روشن کی ہے یارو یہ چراغِ گل سے شمع

چشم و چراغ بادہ کشاں ہے یہ جام ہے　　روشن ہے جس سے دیدۂ مخمور کا چراغ
ہے صرصرِ حوادثِ دوراں کا غم بھی ساتھ　　کیوں کر ہنسے کہیں دلِ مسرور کا چراغ
روشن ترے فروغ سے کیوں کر نہ ہو چراغ　　تو ہی ظفر ہے خانۂ تیمور کا چراغ

پھرے ہے پارۂ دل دیدۂ پُر آب میں یوں　　جلا کے چھوڑ دے جیسے کوئی بھنور میں چراغ

مت گھٹا دل کو مرے لب سے لگا ساغرِ مے　　کہ چلی یاں سے برس کر یہ گھٹا اور طرف

لو میں پروانے کی دلسوزی سے بن جوگن شمع　　شب کو جلتی ہے کھڑی کھولے جٹا اور طرف

دشتِ وحشت کو ارادہ ہے کہ آباد کروں　　کھول دے کاش مرے پاؤں کی زنجیر حریف

نام میرے قتل کا منھ پر نہ قاتل لائیو — سر کے دینے کو ہے میرے ساتھ اک عالم رفیق

اے ظفر آج عجب ابرو ہوا ہے تو بھی — میکشی کرنے کو اس ساقیٔ سرشار سے مل

دل آزاری نے تیری کر دیا بالکل مجھے بے دل — نہ کر اب میری دلجوئی کہ دل جوئی سے کیا حاصل

آجائے گر ہوائے گلستاں قفس تلک — بلبل کا دم ہوا ہو یہ کہہ کر کہ ہائے گل

ڈرتا ہے میرے صرصرِ نالہ سے آسماں — خورشید کا چراغ کہیں ہو نہ جائے گل

اتنا نہ اپنے جامے سے باہر نکل کے چل — دینا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل
کیا چل سکے گا ہم سے کہ پہچانتے ہیں ہم — تو لاکھ اپنی چال کو ظالم بدل کے چل

برنگِ گل نہیں ہوتی شگفتگی دل کو — یہ کس طرح کا اب آیا ہے اے صبا موسم

نظر میں ہے وہ شبابِ نگار کا موسم — خوش آئے کیوں نہ ہمیں لالہ زار کا موسم
اسیرِ کنجِ قفس ہوں میں اے نوانجو — بلا سے میری گر آیا بہار کا موسم[۱]
نہ وہ گلوں کا ہے تختہ نہیں ہے جس کا خزاں — سدا رہے دل داغدار کا موسم
ظفر دکھائے ہے برسات کی ہوا ہم کو — ترے یہ گریۂ بے اختیار کا موسم

---

۱ ایلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے — فروغِ گلشن وصوتِ ہزار کا موسم
(فیض احمد فیض ۱۹۵۲)

تیرے جس دن سے خاک پا ہیں ہم — خاک ہیں ایک کیمیا ہیں ہم
جس طرف چاہے ہم کو لے جاتے — جانتے دل کو رہنما ہیں ہم
جو کہ منھ پر ہے وہ ہی ہے دل میں — مثلِ آئینہ باصفا ہیں ہم
ہم دموشِ صورتِ تصویر — کیا کہیں تم سے بے صدا ہیں ہم
تیرہ بختی میں ہیں یہ بخت سفید — کیا مگر سایۂ ہما ہیں ہم
تو جو نا آشنا ہوا ہم سے — یہ سمجھ ہے کہ آشنا ہیں ہم
ہم ہیں جوں زلفِ وعارضِ خوباں — گو پریشاں ہیں خوشنما ہیں ہم
خوں بہا ایک ناز میں ہے ادا — کشتۂ خنجرِ ادا ہیں ہم
اے ظفر پوچھتا ہے مجھ کو صنم — کیا کہیں بندۂ خدا ہیں ہم

زاہدِ بے مغز کو ہوگی نہ کیفیت نصیب — جامِ مے کیا گرچہ اس کو جامِ جم دے دیں گے ہم
گر کہوں دو گے نشاں کیا تم دمِ رخصت مجھے — ہنس کے کہتے ہیں کہ کچھ دردوالم دے دیں گے ہم

ہم دمو جس دم محبت میں قدم رکھیں گے ہم — دیکھ لینا اس کو بھی اپنا سا کر رکھیں گے ہم
جان ودل تاب وتواں لو رکھو اپنے پاس — یاں ہجومِ غم سے کس کس کی خبر رکھیں گے ہم
کر چکے ہیں امتحاں جس بے وفا کا لاکھ بار — اس سے امید وفا کیا اے ظفر رکھیں گے ہم

کچھ اسیرانِ قفس میں نہ رہا دم شاید — آتی آواز جو ہے خانۂ صیاد سے کم

اب کہاں ہے طاقت پرواز تا بامِ قفس — کر دیا صیاد نے بے بال وپر میرے تئیں
اس کے کوچہ کا تو رستہ دل میں ہے کہتے ہیں لوگ — لے چلی ہے بے خودی تو اب کدھر میرے تئیں

وائے قسمت ہم نشیں ملنے کے کیا آثار ہیں — وہ ہیں اپنے گھر میں بیٹھے ہم پسِ دیوار ہیں

خوف اپنوں کا ہے ان کو ہم کو بے گانوں کا ڈر
مل سکیں کیوں کر وہ مجبور ہیں لاچار ہیں
ہم تو ان کو چاہتے ہیں جان و دل سے ہم نشیں
ہم کو وہ چاہیں نہ چاہیں اس کے وہ مختار ہیں

تھک کے ہم راہِ محبت میں جہاں بیٹھے ہیں
اور وہاں ہم سے بہت راہرواں بیٹھے ہیں
نشہ غفلت کا ہے اتنا کہ نہیں سوجھتا کچھ
آئے کس جائے سے ہم اور کہاں بیٹھے ہیں
ساقیا شیشہ و ساغر ہے کہاں لا جلدی
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بادہ کشاں بیٹھے ہیں
اک قدم ضعف سے ہم اٹھ کے نہیں جا سکتے
صورتِ نقش قدم جم کے جہاں بیٹھے ہیں
پاسِ آداب سے کیوں کر نہ رہے شمع کھڑی
کہ تری بزم میں ہم سوختہ جاں بیٹھے ہیں
اٹھے حیرت زدہ اس بزم سے کیا جوں تصویر
کہ جہاں ان کو بٹھایا ہے وہاں بیٹھے ہیں

صوفیوں میں ہوں نہ رندوں میں نہ میخواروں میں ہوں
اے بتو بندہ خدا کا ہوں گنہگاروں میں ہوں
میری ملت ہے محبت میرا مذہب عشق ہے
خواہ ہوں میں کافروں میں خواہ دینداروں میں ہوں
صفحۂ عالم پہ مانندِ نگیں مثلِ قلم!
یا سیہ رویوں میں ہوں یا سیہ کاروں میں ہوں
نے چڑھوں سر پر کسی کے اور نہ میں پاؤں پڑوں
اس چمن کے نے گلوں میں ہوں نہ میں خاروں میں ہوں
صورتِ تصویرِ میکش میکدہ میں دہر میں
کچھ نہ مدہوشوں میں ہوں میں اور نہ ہشیاروں میں ہوں
نے مرا مونس کوئی ہے اور نہ کوئی غمگسار
غم مرا غمخوار ہے میں غم کے غمخواروں میں ہوں

جو مجھے لیتا ہے پھر وہ پھیر دیتا ہے مجھے
میں عجب اک جنسِ ناکارہ خریداروں میں ہوں

خانۂ صیاد میں ہوں طائرِ تصویر وار!
پر نہ آزادوں میں ہوں میں نے گرفتاروں میں ہوں

اے ظفر میں کیا بتاؤں تجھ سے جو کچھ ہوں سو ہوں
لیکن اپنے فخرِ دیں کے کفش برداروں میں ہوں

شعر افسردہ ظفر کے مت سناؤ بزم میں　　عشق کے مارے ہوئے جتنے ہیں افسردہ سے ہیں

کہیں میں غنچہ ہوں واشد سے خود اپنے پریشاں ہوں
کہیں گوہر ہوں اپنی موج میں میں آپ غلطاں ہوں

کہیں میں ساغرِ گل ہوں، کہیں میں شیشۂ مل ہوں
کہیں میں شورِ قلقل ہوں کہیں میں شورِ مستاں ہوں

کہیں میں جوشِ وحشت ہوں، کہیں میں محوِ حیرت ہوں
کہیں میں آبِ رحمت ہوں، کہیں میں داغِ عصیاں ہوں

کہیں میں برقِ خرمن ہوں، کہیں میں ابرِ گلشن ہوں
کہیں میں اشکِ دامن ہوں کہیں میں چشمِ گریاں ہوں

کہیں میں عقل آرا ہوں، کہیں مجنونِ رسوا ہوں
کہیں میں پیرِ دانا ہوں کہیں میں طفلِ ناداں ہوں

کہیں میں دستِ قاتل ہوں کہیں میں خلقِ بسمل ہوں
کہیں زہرِ ہلاہل ہوں کہیں میں آبِ حیواں ہوں

کہیں میں سرد موزوں ہوں کہیں میں بیدِ مجنوں ہوں
کہیں گل ہوں ظفر میں اور کہیں خارِ بیاباں ہوں

لاکھ چاہت کو چھپائے کوئی پر چھپتی نہیں
پیار کی آنکھ اور الفت کی نظر چھپتی نہیں

اشک بھی ہم پی گئے اور آہ کی ہم نے ضبط
زردیٔ رخسار اے ناصح مگر چھپتی نہیں

کردیا آگاہ سب کو تو نے رازِ عشق سے
تجھ سے دل کی بات اپنے اے ظفر چھپتی نہیں

وہ کارواں کہ جو منزل پہ اپنی جا پہنچا
اسی کے پیچھے رواں صورتِ غبار ہوں میں

جب کہ ہم اٹھ کر تری محفل سے گھر میں آئے ہیں
تنگ کیا کیا اضطرابِ دل سے گھر میں آئے ہیں

کہہ دو شور حشر سے آسودگانِ خاک کو
مت اٹھا تھک کر ابھی منزل سے گھر میں آئے ہیں

کیا کہوں میں کس نشے میں رات دن مخمور ہوں
ایسی کیفیت میں ہوں اپنی خودی سے دور ہوں

دل تو کہتا ہے کہ کہہ دے دل کی اس دلدار سے
پر حیا مانع ہے میں کیوں کر کہوں مجبور ہوں

جی دھڑکتا ہے نکل جائے نہ منہ سے حرفِ راز
یار سب ہشیار ہیں اور میں نشے میں چور ہوں

بھری ہے دل میں جو حسرت کہوں تو کس سے کہوں
سنے ہے کون مصیبت کہوں تو کس سے کہوں

نہ کوہ کن ہے نہ مجنوں کہ تھے مرے ہمدرد
میں اپنا دردِ محبت کہوں تو کس سے کہوں

دل اس کو آپ دیا آپ ہی پشیماں ہوں
کہ سچ ہے اپنی ندامت کہوں تو کس سے کہوں

رہا ہے تو ہی تو غمخوار اے دلِ غمگیں
ترے سوا غمِ فرقت کہوں تو کس سے کہوں

جو دوست ہو تو کہوں تجھ سے دوستی کی بات
تجھے تو مجھ سے عداوت کہوں تو کس سے کہوں

نہ مجھ کو کہنے کی طاقت کہوں تو کیا احوال
نہ ان کو سننے کی فرصت کہوں تو کس سے کہوں

کسی کو دیکھتا اتنا نہیں حقیقت میں
ظفر میں اپنی حقیقت کہوں تو کس سے کہوں

زیادہ لگ تو چلے ہیں ولے ابھی واقف
ہماری خو سے نہیں وہ ہم اس کی خو سے نہیں

زہد و تقویٰ یہ تجھی کو ہو مبارک زاہد / خوب گزرے ہے مری مستی و میخواری میں

آخر تو جان صبح کو کر جائے گی سفر / دو چار اور نالۂ شب گیر کھینچ لوں

ہمدم تم میری حالت مجھ سے کچھ پوچھو نہیں / دیکھ لو چہرے کی رنگت مجھ سے کچھ پوچھو نہیں
تھی جو تم بن شب کو آفت مجھ سے کچھ پوچھو نہیں / شب تھی یا روز قیامت مجھ سے کچھ پوچھو نہیں
دل سے دل کو راہ ہے دل ہی سے اپنے پوچھئے / دل کو جو ہے تم سے الفت مجھ سے کچھ پوچھو نہیں
مجھ سے پوچھو گے جو گزری وہ ہی سب کہہ دونگا میں / اس کو گر سمجھو شکایت مجھ سے کچھ پوچھو نہیں
جو گرہ میں زلف کی ہو اس پہ سوا کیجیے / میری جنسِ دل کی قیمت مجھ سے کچھ پوچھو نہیں
دے کے اپنا دل ظفر اس دشمنِ آرام کو / مجھ پہ جو گزری مصیبت مجھ سے کچھ پوچھو نہیں

رخصتِ پرواز تو صیاد تو دیتا نہیں / طاقتِ پرواز پر کب ہے پر پرواز میں

دے اگر پروانگی صیاد تو دل کھول کر / اور بھی دو چار نالے ہم قفس میں کھینچ لیں

دکھائی دی ہمیں کیفیتِ کونین ہستی میں / نظر آیا خدائی کا تماشا بت پرستی میں
نہ کچھ بادِ خزاں سے کام نے بادِ بہاری سے / کہ میں شکلِ گلِ تصویر ہوں اس باغِ ہستی میں
بتا تو اے پری وش تیرا دیوانہ کہاں جائے / نہ ویرانے میں دل لگتا ہے اس کا اور نہ بستی میں
نہ ہونا تندرستی کا کرے ہے مضمحل جاں کو / کہ ہے نقصانِ حاکم ملک کی بے بندوبستی میں
خدا نے وسعتِ دامانِ ہمت کی عطا مجھ کو / نہیں ہونے کا ہرگز تنگدل وہ تنگدستی میں
کرے صوفی بھی کیا کیا اے ظفر پھر رقصِ مستانہ / دکھائے گردشِ چشم اپنی گر وہ عین مستی میں

لوگ کہتے ہیں کہ وہ تم سے قریں رہتے ہیں / واہ ری بیخبری ہم بھی یہیں رہتے ہیں

رہتے اک جا نہیں آوارہ ترے جوں خورشید
صبح رہتے ہیں کہیں شام کہیں رہتے ہیں

جلوہ دکھلا دے کبھی اپنا اٹھا کر پردہ
تیرے مشتاق ہم اے پردہ نشیں رہتے ہیں

دل میں بستے ہیں ہمارے صنمِ کافر کیش
خانۂ کعبہ میں یہ دشمنِ دیں رہتے ہیں

ساتھ لے جاتے ہیں جو خاک میں بیتابیٔ دل
خاک آرام سے وہ زیرِ زمیں رہتے ہیں

وسعتِ آبادِ جہاں میں ہے جنھیں خواہشِ نام
گھر میں تھی تنگ وہ مانند نگیں رہتے ہیں

بحر پر موج کو کیا خاک گنیں دریا دل
اہلِ بخشش بھی کہیں چیں بہ جبیں رہتے ہیں

تم کبھی راہ پہ بھی آؤ کہ جوں نقشِ قدم
چشم بر راہ کئی خاک نشیں رہتے ہیں

شور و فریاد سے دلہائے ستم کش کے ظفر
روز ہنگامے سرِ چرخِ بریں رہتے ہیں

ہر قدم پر ترے دیوانے سرِ دشتِ جنوں
سیکڑوں خار سدا زیرِ قدم توڑتے ہیں ۱؎

اے ظفر ہے دیکھ کھٹکا باغباں کا کس قدر
باغ میں بلبل کی آج آواز بھی آتی نہیں

چمن ہی پر فقط موقوف کیا ہے اس کی قدرت سے
ہزاروں ہیں ظفر گلہائے رنگا رنگ صحرا میں

کرلے نظارۂ گلزارِ جہاں اے غافل
پھر میسر یہ تماشا کبھی ہونے کا نہیں

دے کے دل اپنا پشیماں ہوں کہ گر جاں اب کے
بچ گئی کام پھر ایسا کبھی ہونے کا نہیں

لگتی ہے اگر آتش پانی سے بجھاتے ہیں
پر اشک مرے دل میں اور آگ لگاتے ہیں

ہیں بخت جو خوابیدہ وہ بھی تو کبھی جاگیں
ہر رات مرے نالے سوتوں کو جگاتے ہیں

۱؎ سرکشی زیبا ہے ہم دیوانگانِ عشق کو
خم ہوئی ہے سیکڑوں کانٹوں کی گردن زیرِ پا
(آتش)

جو تیرے آستاں پر تیرے مائل ہو کے بیٹھے ہیں
تجھے دل دے کے وہ دنیا سے بیدل ہو کے بیٹھے ہیں
اٹھی تھیں آفتیں آگے ہزاروں جن کی صحبت میں
سنا ہم نے انھیں میں پھر وہ شامل ہو کے بیٹھے ہیں
مرے پہلو میں وہ کس وقت بیٹھے مہرباں ہو کر
کبھی بیٹھے بھی ہیں تو میرے قاتل ہو کے بیٹھے ہیں
اٹھو اور آؤ دیکھو حال اس بیمارِ ہجراں کا
مری جانب سے کیوں آپ اتنے غافل ہو کے بیٹھے ہیں

مانندِ شمعِ عشق میں گردن بریدہ ہوں — پر بل بے سرکشی کہ وہی سرکشیدہ ہوں
مطلب نہ آشنا سے نہ دام و قفس سے کام — میں اس چمن میں طائرِ رنگِ پریدہ ہوں
بدلے زلال خضر نہ منھ کا مرے مزا — میں تلخ کامِ زہرِ محبت چشیدہ ہوں
مقدور کیا کہ چشم سے اک بوند بھی گرے — رکھتا مثالِ آئینہ گو آب دیدہ ہوں
وحشت کے وہ ہی ڈھنگ ہیں ہستی سے تا عدم — میں وحشیِ رمیدہ کہاں آرمیدہ ہوں
نے شمعِ انجمن ہوں نہ میں لالۂ چمن — پھر کیوں جہاں میں داغ بہ دل آفریدہ ہوں
ہوں خاک بھی تو خاکِ رہِ پیرِ مے فروش — میں رند مشربوں میں ظفر خوش عقیدہ ہوں

ہار ہو پیشِ نظر یہ کبھی ہونے کا نہیں — ہو تو دیکھو نہ اُدھر یہ کبھی ہونے کا نہیں
سنگ و آہن مری فریاد سے ہوں گرچہ گزار — دل ترا موم ہو پر یہ کبھی ہونے کا نہیں
ضبطِ گریہ کا نہ لے نام تو ہم چشموں میں — تجھ سے وا دیدۂ تر یہ کبھی ہونے کا نہیں
دلِ حیرت زدہ ہے غنچۂ تصویر اپنا — تجھ سے اے بادِ سحر یہ کبھی ہونے کا نہیں
غرق ہو جائے گا گریہ سے مرے ایک جہاں — پر تجھے سوزِ جگر یہ کبھی ہونے کا نہیں
صبر مشکل ہے نہ کر صبر کا دعویٰ ہرگز — عشق میں تجھ سے ظفر یہ کبھی ہونے کا نہیں

محوِ نظارۂ آئینہ فقط وہ ہی نہیں　　دامِ حیرت میں گئے ہم ہی گرفتار سے ہو
کر سکے دل کی نہ آئین آئینہ رو سے کچھ بات　　روبرو اس کے کھڑے رہ گئے ناچار سے ہو

حورانِ بہشتی کا بھی دل میں نہ خیال آئے　　تم خواب میں بھی گر مجھے دیدار دکھاؤ
پہنچا نہ کبھی قافلے تک آہ عزیزو　　مجھ سا بھی جہاں میں کوئی بدنام دکھاؤ

یوں ہی نباہیں گے دوستی ہم اِدھر کی دنیا اگر اُدھر ہو
کریں گے الفت نہ یہ کبھی کم اِدھر کی دنیا اگر اُدھر ہو
عرق جو یہ رخ پہ ہے تمہارے بڑا تعجب ہے ورنہ پیارے
کبھی نہ ٹھہرے گی خور پہ شبنم اِدھر کی دنیا اگر اُدھر ہو
یہ زخم چھاتی پہ ہے ہمارے کسی کے خنجر کی یادگاری
لگانے دیں گے نہ اس پہ مرہم اِدھر کی دنیا اگر اُدھر ہو

کر مجھے قتل وہاں اب کہ نہ ہو کوئی جہاں　　تا مری جان تو کہیں خلق میں بدنام نہ ہو

وحشت سے گریباں کو کرے کیونکہ نہ گل چاک　　زنجیر چمن میں جو لیے موجِ صبا ہو

جس نے صورت اس کی دیکھی بن گیا تصویر آپ　　اے مصور ہاں اگر تصویر ہو ایسی تو ہو
ان کے آتے آتے یاں آئی لبوں پر اپنی جان　　خوب وہ آئے ظفر تاخیر ہو ایسی تو ہو

ہم سا جاں باز ہے وہ کون بشر دیکھیں تو　　رکھ دے اس تیغِ جفا کے تلے سر دیکھیں تو
جن کو دعویٰ ہے بڑا اپنی جگر داری کا　　ان سے کہہ دو کہ مرا زخم جگر دیکھیں تو
گل میں کیا خار میں کیا سب میں ہے یک رنگ بہار　　کھول کر چشمِ حقیقت کو اگر دیکھیں تو

عشق میں ہم ہیں ہتھیلی پہ لیے سر پھرتے
ایسا سرباز ہے یاں کون ظفر دیکھیں تو

رونا میرا پوچھتے کیا ہو چشم سے آنسو بہنے دو
مجھ کو تصور اور بندھا ہے ایک ذرا چپ رہنے دو
تیغ جفا سے وار کرے تو ہاتھ نہ روکو قاتل کا
سینے سے اس کو لگانے دو اور مجھ کو جفائیں سہنے دو

نصیب ایسا تو سوزِ جگر کسی کو نہ ہو — کہ جل کے خاک ہو دل اور خبر کسی کو نہ ہو
جو ایک عیب ہو دیکھیں ہزار غور سے یار — ستم ہے لاکھ ہنر پر نظر کسی کو نہ ہو
ہزار رنج والم ہوں تو سب گوارا ہیں — کسی کا دردِ جدائی مگر کسی کو نہ ہو

عشق کے نزدیک ہے آساں رہِ دشوار غم — آدمی ہمت نہ ہارے دردِ منزل ہو تو ہو
آبِ گریہ سے بجھے آتشِ غم اے ظفر — بلکہ اس سے روز افزوں سوزشِ دل ہو تو ہو

ملا کو جب مذاقِ سخن بھی نہ ہو ظفر — کیا پڑھیے شعر اس بُزِ اخفش کے روبر

رسم الفت نہ عدوئے دل و دیں سے پوچھو — دوستو اس کو جو پوچھو تو ہمیں سے پوچھو
روش نقش قدم خاک میں ملنے کا مزا — اپنے کوچے کے کسی خاک نشیں سے پوچھو
مجھ سے کیا پوچھتے ہو تم سبب سوزشِ دل — اک ذرا اپنے ہی حسنِ نمکیں سے پوچھو
کیا بتائیں تمھیں ہم باعثِ رنجش ان کا — ہم دمو ہم سے نہ پوچھو انھیں سے پوچھو

ہم اپنا عشق چمکائیں تم اپنا حسن چمکاؤ — کہ حیراں دیکھ کر عالم ہمیں بھی ہو تمھیں بھی ہو

جو پینے دے گا نہ یہ محتسب تو یہ میخوار — رہیں گے اس کے لہو کے پیاسے کچھ ہی ہو

بہار آئی اسیرانِ قفس آپس میں کہتے ہیں — پھڑک کر توڑنا ہے گر قفس تیار ہو جاؤ

برنگِ طائرِ تصویر ہوں میں دامِ حیرت میں — رہائی کی مری کوئی جو صورت ہو تو کیوں کر ہو

ہوا ٹھنڈی ہو، آدھی رات ہو، یا وہ ہو یا ہم ہوں — چراغ اس وقت گل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشا ہو

نالے بہم فلک پہ یہ کہتے ہیں لے کے دم — وہ سامنے ہے عرش بریں بس چلے چلو

خواہ کر انصاف ظالم خواہ کر بیداد تو — پر جو فریادی ہیں ان کی سن تو لے فریاد تو
دم بدم بھرتے ہیں ہم تیری ہوا خواہی کا دم — کر نہ بدخوؤں کے کہنے سے ہمیں برباد تو
کیا گنہ کیا جرم کیا تقصیر، میری کیا خطا — بن گیا جو اس طرح حق میں مرے جلاد تو
قید سے تیری کہاں جائیں گے ہم بے بال و پر — کیوں قفس میں تنگ کرتا ہے ہمیں صیاد تو
دل سے دل کو راہ ہے تو جس طرح سے ہم تجھے — یاد کرتے ہیں کرے یوں ہی ہمیں بھی یاد تو

ہم غمِ دوری سے جس کے پہنچے مرنے کے قریب — اس نے اتنا بھی نہ پوچھا کیا ہوا اچھے تو ہو

کہے ہے اور وحشت میری دیوانوں سے زنداں میں — چلو یاں سے کنارے توڑ کر زنجیر کو رکھ دو

مرا منہ سامنے لوگوں کے کہتا ہوں نہ کھلواؤ — ابھی کھل جائے گا جو کچھ کہ ہے سرکار کا پردہ

ہوک سی اٹھتی ہے دل تجھے کے وہیں سینے سے آہ — جب کوئی کہتا ہے چل یہ ہیر کے پہلو سے اٹھ

روکشی کا کرے کس منہ سے ارادہ شیشہ — دل سے نازک نہیں دیکھا تو زیادہ شیشہ
خاک اس دور میں کیفیتِ مے نوشی ہو — سرنگوں ہے قدمِ غم پہ فتادہ شیشہ

دل کو ہم دیکھ چکے بیچ کے دو چار کے ساتھ — اب اسے بیچیں گے اک اور خریدار کے ہاتھ
روتا ہوں کوٹ کے میں سینہ کو یاد آتا ہے — ہنسنا اس یار کا زانو پہ مرے مار کے ہاتھ
ابر چاہے ہے کہ ہم چشم ہمارا ہووے — آبرو اپنی ہے اب دیدۂ خوں بار کے ہاتھ

ہو کیوں کہ کسی سے ظفر امیدِ محبت — ہم جانتے ہیں جیسے ہیں احباب زمانہ

جب پھڑک بھی نہ سکے طاقتِ پرواز کہاں — دیے صیاد نے اس صید کے پر کھینچ کے باندھ

ہوا جدا نہ کبھی غم تری جدائی کا — رہا ہمیشہ مری جانِ بیقرار کے ساتھ
ملا یا خاک میں مانندِ نقشِ پا تم نے — سلوک خوب کیا اپنے خاکسار کے ساتھ
لگا نہ دامنِ دلدار سے کبھی افسوس — صبا نے لاگ یہ باندھی مرے غبار کے ساتھ

جب تلک دم ہے رہیں گے یوں ہی غم ساتھ کے ساتھ
دیکھنا جائیں گے غم اور یہ دم ساتھ کے ساتھ[1]

کوچۂ یار سے جاتا ہے نہ دل اور نہ ہم
جا کے پھر آتے ہیں دو چار قدم ساتھ کے ساتھ

ڈرتے واعظ نہیں ہم گور کی تاریکی سے — عشق کے داغ سے اک ایسا چراغ آیا ہاتھ

---

[1] قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
(غالب)

قفس کے ٹکڑے اڑادے جو پھڑ کے اے صیاد　　اگر چہ دم نہیں مرغ شکستہ بال میں کچھ

گلشنِ دہر میں گلچینِ خزاں کا ہو بُرا　　جس نے بوئے ہیں مرے حق میں سراسر کانٹے

ہمرہاں پہنچے کبھی کے منزلِ مقصود پر　　بس اکیلے رہ گئے ہیں راہ ہم بھولے ہوئے

ظفر کس طرح کوئے یار میں جاؤں کہ پاؤں میں　　مرے ہر ایک موجِ اشک نے زنجیر ڈالی ہے

ساغر کشی ظفر میں اس دور میں کروں کیا　　شیشے پڑے ہیں خالی ہے مستِ خواب ساقی

گلشن میں سحر بن ترے اے نوگلِ خوبی　　ہر قطرۂ شبنم مجھے ہیرے کی کنی ہے

شب کو ساتھ اس سیم تن کے جب ہو سونے کا مزا　　ران رکھے ران پر بازو پہ بازو کو دھرے

گردشِ ایام کے ہاتھوں سے اب کے اے ظفر　　ساتھ تیرے یہ میسر کب ہے مے نوشی مجھے

یہ غزل پڑھئے اگر بزم سخنداں میں ظفر　　کیونکہ تحسیں کے لیے پھر سرِ میر ہلے

منزلِ عشق بہت دور ہے اللہ اللہ　　ایک ہی گام میں تم تھک کے ظفر بیٹھ گئے

کچھ ہوش میں بھی آنے دے مجھ کو خدا سے ڈر　　اے بیخودی چلی ہے تو لے کر کدھر مجھے
چاک قفس سے دیکھ رہا ہوں رخِ چمن　　صیاد سے نہیں ہوسِ بال و پر مجھے

نہیں ہے طاقتِ پرواز اے صیاد
خدا کرے کہ تو اب وا درِ قفس نہ کرے

جو اس کی جان پہ گزرے ہے وہ ہی جانے ہے
خدا کسی کو جہاں میں کسی کے بس نہ کرے

دیکھا جو کل اک عاشق و معشوق کو بہم
اپنی نظر میں بس تری تصویر پھر گئی

رخ پہ کیا زلف ترے غنچہ دہن چھوٹے ہے
ہم سیہ بختوں سے آخر کو وطن چھوٹے ہے

ہمصفیرو مری فریاد وفغاں گلشن میں
آہ کیا ہوتا جو پاس آکے قفس کے سنتے

ہے ہلاتا حلقۂ زنجیر کوئی آشنا
آپ کا ہوگا اسے دیکھو بلاؤ کون ہے

مرجھائے ہے کیوں کر یہ گلِ زخمِ دل اپنا
کہتے ہیں گلشن میں اب آمد ہے خزاں کی
بولے کہ کہیں گم نہ کریں راہ مسافر
اک شخص نے کل میری کہانی جو بیاں کی
سچ ہے کہ وہی جانے کہ جس شخص پہ گزرے
اس بت کو خبر کیا ہے مرے دردِ نہاں کی

مسجد و میخانہ میں کیا فرق ہے دونوں ہیں ایک
ایک سے ہیں سنگ وحشت اور ایک سی دیوار ہے

دل ہی ہے پوچھو عشق میں جو دل پہ بن گئی
بسمل ہی جانتا ہے جو بسمل پہ بن گئی
برپا ہو کیوں نہ خانۂ زنداں میں روز غل
میرے جنوں سے اب تو سلاسل پہ بن گئی
تزئیں جو دی وفا نے تو میرے لہو کی چھینٹ
بوٹی سی ایک دامنِ قاتل پہ بن گئی
ہستی کے باغباں کی ظفر پوچھتا ہے کیا
جو کچھ چمن میں جانِ عنادل پہ بن گئی

ہوا ہے فصلِ گل میں جوشِ وحشت اس قدر پیدا — کہ ہر موجِ ہوا پہنے ہوئے زنجیر پھرتی ہے

آہ کیا جانے طبیبِ عشق کس کی یاد میں — ہوک سی اٹھ کر کلیجے میں مرے رہ جائے ہے

اب تو پھڑکے ہے قفس میں بلبل تازہ اسیر — کوئی دن کو دیکھنا اس کو یہیں ہل جائے گی

پھر موسمِ بہار میں برپا ہوا جو غل — کیا وحشیوں کے پاؤں کی زنجیر کھل پڑی

رہائی دستِ صیادِ جفا پیشہ سے مشکل ہے — قفس میں طائرِ محبوس لاحاصل پھڑکتا ہے

جو کچھ ترے ہاتھوں سے ہوا مجھ پہ ستم ہے — سب میں نے سہا ہے
میں منھ سے نہیں کہنے کا جب تک مرا دم ہے — بس صبر کیا ہے

جتنا کہ ستاتا ہے ستانے دو عزیزو — کچھ اس سے نہ بولو
ہم جانتے ہیں جس پہ وہ مغرور صنم ہے — اپنا بھی خدا ہے

مانندِ حباب ایک نفس آنکھ سے اپنی — تو پردہ اٹھادے
پھر دیکھو جو کچھ عالم ہستی وعدم ہے — سب جلوہ نما ہے

بیمار ترا ضعف سے ظالم سرِ بستر — ہل بھی نہیں سکتا
تصویرِ نہالی ہے کہ وہ نقشِ قدم ہے — کیا جانئے کیا ہے

اکسیر سے نے کام نہ تسخیر سے مطلب — نے جب نہ یہاں بغض

درکار ظفر ہم کو فقط اس کا کرم ہے　　دھیان اس سے لگا ہے

دل پئے دشت نوردی کے تو ہر چند رہے　　پر تھکے ضعف سے ہم ایسے کہ پابند رہے
کھلے رہتے تھے فلک جن کے یہاں بابِ نشاط　　قفلِ غم ایسا لگا ان پہ کہ یہ بند رہے
کوئی مغموم رہا یاں تو بلا سے ان کی　　وہ تو بزمِ طرب عیش میں خورسند رہے
دل گیا، صبر گیا، درد رہا، رنج رہا　　ہم نشیں اپنے ظفر چند گئے چند رہے

دردِ دل درد آشنا جانے　　اور بے درد کوئی کیا جانے
زلف تیری ہے وہ بلا کافر　　پوچھ مجھ سے تری بلا جانے
کردیا اک نگاہ میں بے خود　　چشمِ کافر ہے کیا خدا جانے
اپنے بیمار عشق کو تو اگر　　زہر بھی دے تو وہ دوا جانے
سرفرازی اسی کو ہو تو ظفر　　آپ کو سب کا خاکِ پا جانے

جلوہ جو اس نے دکھایا مرا جی جانتا ہے　　پھر خدا ہی نظر آیا مرا جی جانتا ہے
اٹھ گئی میری زباں پر سے جہاں کی لذت　　جو مزا عشق میں پایا مرا جی جانتا ہے
میں خطاوار ہوں خط کیوں کہ لکھو گے کہ تمھیں　　جیسا لوگوں نے پڑھایا مرا جی جانتا ہے
کون کہتا ہے ترے عشق سے انجان رہا　　جیتے جی تو نے جلایا مرا جی جانتا ہے
یا تو وہ جانتا ہے جو ہے مرے جی کا خیال　　اور یا بارِ خدا یا مرا جی جانتا ہے
کیا کہوں تم سے اجی اب تو ہے جینا بھی محال　　جیسا جی تم نے ستایا مرا جی جانتا ہے
اے ظفر اس گلِ خنداں کی محبت نے مجھے　　دم بہ دم جیسا رلایا مرا جی جانتا ہے

رونق گلشن بہارِ گلِ جو کم ہوتی چلی　　اشکِ شبنم سے نسیم صبح دم روتی چلی
وہ ہوش کیا خاک پہنچے منزلِ مقصود پر　　جو قدم رکھتے ہی کانٹے راہ میں بوتی چلی

ہو چکے دن ضبطِ گریہ کے کہ پی جاتے تھے اشک
اب تو چشمِ تر ظفر کچھ آبرو کھوتی چلی

دیکھوں جو مرقع کو تو جی کیوں کہ نہ اڈے
صورت کوئی مل جائے ہے صورت میں کسی کی

سیر کی جائے کوچۂ ہستی
غیر بھی آشنا نکلتا ہے

شمشیر برہنہ مانگ غضب آنکھوں کی چمک پھر ویسی ہے
جوڑے کی گندھاوٹ قہرِ خدا بالوں کی مہک پھر ویسی ہے
ہر بات میں اس کی ہے گرمی ہر ناز میں اس کے ہے شوخی
قامت ہے قیامت چال پری چلنے میں پھڑک پھر ویسی ہے
محرم ہے حبابِ آبِ رواں سورج کی کرن ہے اس پہ نپٹ
جالی کی کرتی ہے وہ بلا گوٹے کی دھنک پھر ویسی ہے
وہ گائے تو آفت لائے ہے ہڑتال میں لیوے جان نکال
ناچ اس کا اٹھائے سو فتنہ گھنگرو کی جھنک پھر ویسی ہے
ہر بات پہ ہم سے وہ جو ظفر کرتا ہے رکاوٹ مدت سے
اور اس کی چاہت رکھتے ہیں ہم آج تلک پھر ویسی ہے

بہار جب تھی کہ پہلے بہار سے صیاد
چمن میں بلبلِ بے بال و پر پہنچ جاتی

دنیا دارو دنیا چھوڑو دنیا میں بدنامی ہے
اس دنیا کے ترک کیے سے ہوتی نیک انجامی ہے
رنج و قلق ہے درد و الم ہے حسرت ہے ناکامی ہے
دوری میں اس راحتِ جاں کے کیا کیا بے آرامی ہے

منہ جو اپنا کھولے ہوئے سوفار ہیں اس کے تیروں کے
کون سے صیدِ عشق کا یارب قصدِ خوں آشامی ہے

کس کی حمایت ڈھونڈیں ہم اور کس سے مرہم چاہیں ظفر
رکھتے نظر ہیں اپنے خدا پر وہ ہی ہمارا حامی ہے

جام ہے، شیشہ ہے، ساقی بھی ہے برسات بھی ہے
ان دنوں بادہ کشی دن بھی ہے اور رات بھی ہے

کچھ تو ہے اپنی طرف سے طلبِ ساغر مئے
اور ساقی کی کچھ امداد ومدارات بھی ہے

جوشِ مستی بھی ہے ، ہنگامِ ہم آغوشی ہے
خواہشِ وصل بھی ہے جائے ملاقات بھی ہے

ساز ومطرب بھی ہے اور نغمہ بھی ہے رقص بھی ہے
ساتھ ہر تار کے آنکھوں سے اشارات بھی ہے

وہ بھی سرمست ہے اور ہم بھی نشے میں سرشار
ہاتھ گردن میں ہے اور لطف وعنایات بھی ہے

یار ہے یار کے ہے ساتھ ظفر بوس وکنار
اور اگر چاہیے کچھ بات تو وہ بات بھی ہے

بھلی کہتے برائی ہوتی ہے — منہ سے نکلی پرائی ہوتی ہے
ان کے دل میں غبار ہے دیکھیں — کس طرح سے صفائی ہوتی ہے
اپنے مرنے کا غم نہیں لیکن — ہائے تجھ سے جدائی ہوتی ہے
اے ظفر ہے جدھر وہ بت پھرتا — اس طرف سب خدائی ہوتی ہے

یہ کیا غضب ہے کہ لڑتے ہیں آپ بھی ہم سے — تمہارے واسطے دیکھو ہم اک جہاں سے لڑے

حسرت اے طاقتِ پرواز کہ ہم اڑ نہ سکے — گر کے پھڑکا کئے دیوارِ گلستاں کے تلے

تا درِ جاناں ہمیں اول تو جانا منع ہے — اور گئے تو حلقۂ درکا ہلانا منع ہے
حلقہ در گر ہلایا بھی تو بولے کون ہے — اب بتائیں کیا کہ نام اپنا جتانا منع ہے
آنکھ اٹھا کر بھی اگر دیکھا تو وہ پردے میں ہے — سامنے بے پردہ ہوکر ان کو آنا منع ہے
نام بتلایا جو میں نے تو وہ سن کر چپ رہے — پھر پکاریں کس طرح سے غل مچانا منع ہے
غل مچا کر گر پکارا بھی تو جھنجھلا کر کہا — جاؤ کیوں آئے تمھیں گھر میں بلانا منع ہے
اور بلایا بھی تو پھر جائیں وہاں ہم کس طرح — وہ جہاں ہیں ہم کو واں تک بار پانا منع ہے
بار پا کر کچھ اگرچہ ہم گئے بھی واں تلک — آنکھ اٹھا کر کیوں کہ دیکھیں آنکھ اٹھانا منع ہے
سامنے بھی وہ کسی صورت سے گر آئے تو پھر — بولنا ہنسنا تو کیا واں مسکرانا منع ہے
مسکرائے بھی تو کچھ چپکے ہی چپکے غنچہ اور — دل میں کیا کیا مدعا اور لب ہلانا منع ہے
لب ہلائے بھی تو کی کچھ بات منھ سے اور ہی — پڑھنا ہر مطلب پہ شعرِ عاشقانا منع ہے
عاشقانہ شعر بھی کوئی پڑھا تو پڑھ کے پھر — آہ بھرنا منع ہے آنسو بہانا منع ہے
آہ بھر کر کچھ اگر آنسو بہائے بھی تو پھر — وہ جو دل کی بات ہے اس کو جتانا منع ہے

بات گر دل کی جتائی بھی تو پھر ہوتا ہے کیا
اے ظفر ایسی جگہ دل بھی لگانا منع ہے

صدمۂ آہ سے پھٹ جائے نہ صیاد کا دل — اپنی اے ہم نفسو طرزِ فغاں اور ہی ہے

خیالِ یار کو دل سے کہو کیوں کر نکالوں میں — کہ مشکل سے پری کو میں نے شیشے میں اتارا ہے

فرشِ مخمل پر بھی مشکل سے جنھیں آتا تھا خواب　　خاک پر سوتے ہیں اب وہ پاؤں پھیلائے ہوئے

چمن دہر میں وہ بلبلِ تصویر ہوں میں　　کہ مجھے رنگِ بہاراں وخزاں ایک سا ہے

اور بھڑکی آتشِ غم اوردل جلنے لگا　　سانس جو ہم ٹھنڈی ٹھنڈی دم بہ دم لینے لگے

میرا لہو پاؤں سے مل کے چھٹاتے ہو کیا　　سرخیٔ خوں اور ہے رنگِ حنا اور ہے
نالۂ نے میں کہاں دل کی فغاں کا اثر　　اس کی صدا اور ہے اس کی صدا اور ہے

کسی پردہ نشیں کا ہے شوق لگا کوئی طرح اب ایسی بتادے مجھے
کہ اٹھا کے وہ پردۂ شرم وحیا ذرا اپنا جمال دکھادے مجھے
ترے دیکھنے کے ہیں سیکڑوں ڈھب نہیں دیکھتا میں تو یہی ہے سبب
کہ تجلیٔ حسن سے برقِ غضب کہیں ایسا نہ ہو کہ جلادے مجھے
مجھے قتل کیا تو یہ اس نے کہا کہ تو رنج وعذاب سے چھوٹ گیا
ترے ساتھ یہ میں نے سلوک کیا مرے کشتۂ ناز دعادے مجھے
رہی اتنی بھی طاقت وتاب نہیں کہ زمیں سے اب اٹھے خاک نشیں
ترے کوچے کی سمت بلا سے کہیں مرا گریۂ شوق بہادے مجھے
نہ ہو دامِ علائقِ جسم اگر کروں گلشنِ قدس کی سیر ظفر
کوئی ایسا ہو کاملِ پاک نظر کہ جو قید ہے اس سے چھڑادے مجھے

ہوگیا صبحِ قیامت کا بھی منہ دیکھ کے فق　　ہم جو محشر میں گئے چاک گریباں گئے

پاس جاناں کے کہا کس نے کہ جانا منع ہے　　دل کو پر اس دشمنِ جاں سے لگانا منع ہے
اپنے زخموں سے کہا ہنس ہنس کے زخمی نے ترے　　آج ہے شادی کا دن آنسو بہانا منع ہے

عشق کے مذہب میں واجب ہے بہانا اپنا خون — خوں بہا کا ذکر پر قاتل سے لانا منع ہے
عشق میں دل کو ظفر کس نے دیئے یہ آبلے — یہ وہ ہے بیمار جس کو آب و دانا منع ہے

نازاں ہے غیر ناحق اپنی مصاحبت پر — رہتی تھی یوں ہی صحبت ان سے کبھو ہماری
اس گل کے تا بہ دامن پہنچے نہ اے صبا ہم — برباد خاک تونے کی کو بہ کو ہماری
پایا تو اس کو ہم نے دل کے مکاں میں پایا — دیر و حرم میں بے جا تھی جستجو ہماری

ظفر کیا پوچھتا ہے راہ مجھ سے اس کے ملنے کی — ارادہ ہو اگر تیرا تو ہر جانب سے رستا ہے

شمع جلتی پر اس طرح کہاں جلتی ہے — ہڈی ہڈی مری اے سوزِ نہاں جلتی ہے
تم جو ہر بات پر کرتے ہو شرارت مجھ سے — کیا طبیعت مری اے شعلہ رخاں جلتی ہے
شمع جلنے میں نہیں گر تری تاثیر تو کیوں — جان پروانہ کی اے سوختہ جاں جلتی ہے

صیاد نے دی رخصتِ پرواز پر افسوس — تو نے نہ اجازت مجھے بے بال و پری دی

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی — جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار — بیقراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی
اس کی آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو — کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی
عکسِ رخسار نے کس کے ہے تجھے چمکایا — تاب تجھ میں مہِ کامل کبھی ایسی تو نہ تھی
اب کی جو راہ محبت میں اٹھائی تکلیف — سخت ہوتی ہمیں منزل کبھی ایسی تو نہ تھی
پائے کوباں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں — آتی آواز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی
نگہ یار کو اب کیوں ہے تغافل اے دل — وہ ترے حال سے غافل کبھی ایسی تو نہ تھی
چشمِ قاتل مری دشمن تھی ہمیشہ لیکن — جیسی اب ہوگئی قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا سبب تو جو بگڑتا ہے ظفر سے ہر بار　　خو تری حور شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

آ گئی تھی اس پری وش کی ذرا صورت نظر　　اب تلک ہے صورتِ آئینہ حیرانی مجھے
میں اگر بھاگا تو پھر ہرگز نہیں آنے کا ہاتھ　　کہہ وحشت سے کہ کیوں چھیڑے ہے دیوانی مجھے

کیا نکل بھاگے ترے دیوانے زنداں سے کہ ہے　　طوق بھی خالی پڑا زنجیر بھی خالی پڑی
تیشۂ آہِ سحر سے کیا نہ ٹوٹا کوہِ غم　　بلکہ ضربِ نالۂ شب گیر بھی خالی پڑی

تری جفا میں بھی وہ اک ادا نکلتی ہے　　کہ تجھ پہ جان ہی اے پر جفا نکلتی ہے
نسیمِ خلد پہ کرتی ہے کس طرح کا ناز　　تری گلی سے جو ہو کر صبا نکلتی ہے
کہوں میں کیا ترے احسانِ تیغ اے قاتل　　کہ زخم زخم کے منھ سے دعا نکلتی ہے
بھری ہے دل میں کسی کے جو اس کی حسرتِ وصل　　نہ جیتے جی نہ وہ بعدِ فنا نکلتی ہے

مجھ کو نہ گریباں سے نہ داماں سے گلہ ہے　　پر دستِ جنوں کو تنِ عریاں سے گلہ ہے
دیکھی نہ کبھی خواب میں بھی زلفِ پریشاں　　آنکھوں کو میرے خوابِ پریشاں سے گلہ ہے
شکوہ ہے اگر مجھ کو تو وحشت سے ہے اپنی　　نے دشت سے نے خانۂ زنداں سے گلہ ہے

رو رو کے کیا رازِ دل اس نے مرا افشاں
مجھ کو ظفر اس دیدۂ گریاں سے گلہ ہے

گرمیٔ دل سے ہیں یہ سینہ و پہلو جلتے　　کہ نکلتے مری آنکھوں سے ہیں آنسو جلتے

پاسِ خاطر تھا اسیری میں ہمیں صیاد کا　　ورنہ ہوتا دام سو ٹکڑے اگر پر مارتے

قفس سے چھوٹتا ہے جب کہ اڑنے کی نہیں طاقت　　ستم صیاد کیا کرتا اسیرِ ناتواں پر ہے

سنے ہیں خاطرِ ناصح سے ہم کہ ہے کچھ بات　　وگرنہ اتنا کہاں یاں دماغ رکھا ہے

جاتے ہیں اب تو ساتھ ترے اس گلی میں ہم　　جیتے رہے تو اے دلِ مضطر پھر آئیں گے

ترا خیال اے زلفِ پرخم جیسا تھا ویسا ہی ہے
دل کے پیچ وتاب کا عالم جیسا تھا ویسا ہی ہے
ابر برس کر کھل بھی گئے اور نالے چڑھ کر اترے بھی
لیکن جوشِ دیدۂ پرنم جیسا تھا ویسا ہی ہے
تھا نہ یہ آگے منزلِ عشرت اور نہ اب ہے راحتِ گاہ
خانۂ دنیا خانۂ ماتم جیسا تھا ویسا ہی ہے
زلف الجھ کر سلجھے ہے پر ہم سے یوں ہی بے جرم وخطا
تیرا مزاج اے کافر برہم جیسا تھا ویسا ہی ہے
زخمِ جگر کا حال نہ پوچھو چارہ گروں یاں کتنے ہی
پھائے بدلے رکھا مرہم جیسا تھا ویسا ہی ہے
غنچے ہزاروں ہوتے شگفتہ دیکھے چمن میں ایک ظفر
دل یہ گرفتہ خاطر پرغم جیسا تھا ویسا ہی ہے

یہ کس سرباز کے سر پر نیا ہنگامہ برپا ہے　　کہ قاتل جمع کوچے میں ترے خلقت لگی ہونے

ہمیں بس بس نہ سمجھاؤ اٹھو اے ناصحو جاؤ　　پڑے ہیں ہم کسی ایسے کے بس میں کچھ نہیں چلتی
دل وجاں سوزشِ غم سے پھکنے جاتے ہیں کیا کیجیے　　لگی ہے آگ وہ اس خاروخس میں کچھ نہیں چلتی

گل کچھ تو اس چمن کی ہوا کھا کے جھڑ پڑے — وہ کیا کریں کہ غنچہ ہی مرجھا کے جھڑ پڑے
کیسی ہوا چلی چمنِ دل میں اے ظفر — سب برگ و بارِ نخلِ تمنا کے جھڑ پڑے

نہ رہی تاب و تنے نواں باقی — ہے فقط تن میں ایک جاں باقی
بل بے سوز وگدازِ غم نہ رہا — نام کو مغزِ استخواں باقی
شمع ساں دل تو جل بجھا لیکن — ہے ابھی دل میں کچھ دھواں باقی
ہے کہاں کوہ کن کہاں مجنوں — رہ گیا نامِ عاشقاں باقی
خاکِ دل تفتگاں پہ رکھ نہ قدم — ہے ابھی سوزشِ نہاں باقی
خال خال اس زمانے میں ہوگا — اے ظفر کوئی نکتہ داں باقی

قفس کے ٹکڑے اڑادوں پھڑک پھڑک کر آج — ارادہ میرا اسیرانِ ہم نفس یوں ہے

اڑ گئی صیاد اب دل سے ہوس پرواز کی — بیٹھا رہنے دے قفس میں ہم کو پر جھاڑے ہوئے

شکوۂ رنجش نہ کر ہیں اب تو لطف ان کے ظفر — گر عتاب ایسے ہوئے تو پیار بھی ایسے ہوئے

اے صبا برباد کر دی تو نے پروانے کی خاک — ورنہ ہوتا ڈھیر شمعِ صبح گاہی کے تلے

دل کا سودا اک نگہ پر ہے تری ٹھہرا ہوا — نرخ تو کیا پوچھتا ہے اب تو قیمت کھل گئی
تھی اسیرانِ قفس کو آرزو پرواز کی — کھل گئی کھڑکی قفس کی کیا کہ قسمت کھل گئی

کوچہ گردی کی جو کچھ دل میں ہوس باقی ہے — خاک بھی اڑتی مری بعدِ فنا پھرتی ہے

عشق تو مشکل ہے اے دل کون کہتا سہل ہے
لیک نادانی سے اپنی تو نے سمجھا سہل ہے

گر کھلے دل کی گرہ تجھ سے تو ہم جانیں تجھے
اے صبا غنچے کا عقدہ کھول دینا سہل ہے

ہم دمو دل کے لگانے میں کہو لگتا ہے کیا
پر چھڑانا اس کا مشکل ہے لگانا سہل ہے

گرچہ مشکل ہے بہت میرا علاج دردِ دل
پر جو تو چاہے تو اے رشکِ مسیحا سہل ہے

ہے بہت دشوار مرنا یہ سنا کرتے تھے ہم
پر جدائی میں تری ہم نے جو دیکھا سہل ہے

شمع نے جل کر جلایا بزم میں پروانے کو
بن جلے اپنا جلانا کیا کسی کا سہل ہے

عشق کا رستہ سراسر ہے دمِ شمشیر پر
بوالہوس اس راہ میں رکھنا قدم کیا سہل ہے

اے ظفر کچھ ہو سکے تو فکر کر عقبیٰ کا تو
کر نہ دنیا کا تردد کارِ دنیا سہل ہے

خزاں سے سرخیٔ گلہائے صحنِ باغ اڑی
مگر نہ رونقِ دلہائے داغ داغ اڑی

برنگِ نکہتِ گل یہ مری سبکدوشی
مجھے کہاں سے کہاں لیکے بافراغ اڑی

پہنچ گئی نہیں اس گل کی بو جو بلبل کو
تو کیوں چمن سے وہ یوں ہو کے بے دماغ اڑی

پڑا جو عکسِ رخِ آتشیں ترا ساقی
لگی ایاغ میں آگ اور مئے ایاغ اڑی

کہاں کہاں اسے پیکِ خیال ڈھونڈھ پھرا
ظفر ذرا بھی نہ گردِ رہِ سراغ اڑی

یارو وہ ہے بگڑا ہوا باتیں نہ بناؤ
کچھ پیش نہیں جانے کی تقدیر کسی کی

روشِ گل میں کہاں یار ہنسانے والے
ہم کو شبنم کی طرح سب ہیں رلانے والے

سوزشِ دل کو نہیں اشک بجھانے والے
بلکہ ہیں اور بھی یہ آگ لگانے والے

منھ پہ سب زردیٔ رخسار کہے دیتی ہے
کیا کریں راز محبت کے چھپانے والے

خاک بھی ہوگی ترے کوچے میں اپنی برباد
ہم تو مر کر بھی یہاں سے نہیں جانے والے

دیکھیے داغ جگر پر ہوں ہمارے کتنے
وہ تو اک گل ہیں نیا روز کھلانے والے

دل کو کرتے ہیں بتاں تھوڑے سے مطلب پر خراب
اینٹ کے واسطے مسجد ہیں یہ ڈھانے والے

خاک میں ہم کو ملاتے ہیں وہ جوں نقشِ قدم ۔۔۔ زیرِ پا جن کے ہم آنکھیں ہیں بچھانے والے

لگا رہتا ہے تیرا باغ میں اے باغباں کھٹکا ۔۔۔ کہاں مرغِ چمن شاخِ شجر پر جم کے بیٹھے ہے

آگے ظفر یہ حال تھا اپنا ہم غم سے گھبراتے تھے ۔۔۔ ہو گئے ہیں غم کش ایسے اب ہم سے غم گھبراتا ہے

کھول دے صیاد تو کھڑکی قفس کی شوق سے ۔۔۔ بلبلِ بے بال و پر ظالم کدھر اڑ جائے گی

ناصح نہ پوچھ مجھ سے فصلِ بہار میں ۔۔۔ ہاتھوں سے کیا جنوں کے گریبان پر بنی

ابھی ہونے کا نہیں لڑنے کو تیار عدو ۔۔۔ پھڑکے یہ مرغ تو دو چار برس میں پھڑکے

نصیب اچھے اگر بلبل کے ہوتے ۔۔۔ تو کیوں پہلو میں کانٹے گل کے ہوتے
جو ہوتا ظرفِ ساقی ہم کو معلوم ۔۔۔ تو منت کش نہ جامِ مل کے ہوتے
ہمارے وقت میں فرہاد و مجنوں ۔۔۔ جو ہوتے دن بسر مل جل کے ہوتے
نہ ہوتے حضرتِ دل پا بہ زنجیر ۔۔۔ جو سودائی نہ اس کاکل کے ہوتے

ظفر سنتے جو تیرے شعر پھر وہ
نہ قائل طالب آمل کے ہوتے

صحبتِ گل ہے فقط بلبل سے کیا بگڑی ہوئی ۔۔۔ آج کل سارے چمن کی ہے ہوا بگڑی ہوئی
دل شکستوں کا سخن کیوں کر نہ ہوئے نادرست ۔۔۔ ساز بگڑے ہے تو نکلے ہے صدا بگڑی ہوئی
مجمعِ خوباں میں گر تصویر بن کر جائے یار ۔۔۔ آئے پھر صورت نظر سب کی دلا بگڑی ہوئی
بے خبر تو اس کی اے عیسیٰ نفس جلدی کر آج ۔۔۔ ہے ترے بیمار کی حالت سوا بگڑی ہوئی

کھل گئی ہم پر کہ رندوں سے کہیں بگڑی ہے آج　　سر پہ ہے پگڑی جو تیرے زاہدا بگڑی ہوئی
دیکھیے کیسے بنے ہر بات پر بگڑے ہے تو　　ہے تری خو بے طرح اے دل ربا بگڑی ہوئی
ہیں سبھی باتیں بناتے پر ہیں قائل اس کے ہم
اے ظفر جو بات دے کوئی بنا بگڑی ہوئی

قامتِ یار کی جب رعنائی　　یاد آئی تو قیامت آئی
زلف سے کیا تھا سروکار اسے　　دل کو ہوناتھا مگر سودائی
حُسن کے واسطے شہرت درکار　　عشق کو چاہیے ہے رسوائی
دل جو الجھے تو اسے سلجھاؤ　　زلف سلجھائی تو کیا سلجھائی
جنبشِ دامنِ مژگاں نے تری　　دل کی آگ اور سوا بھڑکائی
تم نہ آئے سرِ بالیں افسوس　　اور مری جان لبوں پر آئی
دلِ بیتاب کو ٹھہرائیں گے ہم　　تم نے آنے کی اگر ٹھہرائی
دیکھ اندوہ کا دل پر اندوہ　　اے ظفر جان بہت گھبرائی

کسی سے دل جو اے ہمدم لگا ہے　　تو دل کو ایک گویا غم لگا ہے
ترا جس دن سے عالم میں نے دیکھا　　مجھے بھی دیکھنے عالم لگا ہے
ذرا تھمتا نہیں تیرا جو رونا　　تجھے کیا روگ چشمِ نم لگا ہے
پلا آبِ دمِ خنجر کو قاتل　　پھڑکنے پیاس سے یاں دم لگا ہے
نہیں ہے تجھ کو دل کی قدر ورنہ　　ترے ہاتھ اک نگینِ جم لگا ہے
نہ پھیلا پاؤں اس منزل میں غافل　　کہ سر پر کوچ یاں ہر دم لگا ہے
لگاتا ہے جو تو اک اور شمشیر　　ارے کیا زخم پہلے کم لگا ہے
ظفر تم طائرِ دل کو بچاؤ
کہ دامِ کاکلِ پُرخم لگا ہے

مر گئے آخر پھڑک کر دام سے چھوٹے نہ ہم دل کی دل ہی میں تمنائے رہائی رہ گئی

کس توقع پر کسی سے ہم لگائیں اپنا دل اے ظفر بالکل جہاں سے رسمِ الفت اٹھ گئی

ناصحا دیکھ ہمیں چشمِ حقارت سے نہ دیکھ ارے کمبخت اسے تو نے نہیں دیکھا ہے

ان دنوں جوبن جو ہے ان پر تو کس کس ناز سے راہ میں چلتے ہیں وہ اپنی پھبن کو دیکھتے

جلد آئے اس سے کہہ دو کہ دنیا سے ہم چلے اٹکھیلیوں سے اب تو نہ گن گن قدم چلے
محفل سے تیری اٹھ کے جو ہم صبح دم چلے مانند شمع داغ یہ دل چشم نم چلے
دیوانے تیرے قید سے ہستی کے چھوٹ کر کیا بافراغ جانبِ دشتِ عدم چلے
قبلہ ہو تیرا در تو کریں منھ نہ ہم ادھر پر کیا کریں جو دل پہ نہ بس اے صنم چلے
کیا جانے راہِ عشق کی تکلیف بوالہوس معلوم ہو جو ساتھ مرے دو قدم چلے

اے صبا ہوں بلبلِ تصویر مجھ کو کیا خبر کب بہار آئے ہے گلشن میں خزاں کب جائے ہے
کاہیکو میری سمجھ میں آئے گی ناصح کی بات ہے وہ دیوانہ کہ جو دیوانے کو سمجھائے ہے

اگرچہ لے کے دل تو نے دل آزادی بہت سی کی تری اس پر بھی ہم نے ناز برداری بہت سی کی
نہ آیا حرفِ شکوہ جب زباں پر سادہ لوحوں کی تو اس نے اور بھی مشقِ ستم گاری بہت سی کی

لگ چلا منھ سے بہت میری طرح سے نہ کہیں آئینہ بھی نظرِ غیرت مہ سے گر جائے

واعظا سوزِ محبت سے زیادہ نہیں وہ تو جواب آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے مجھے

کوئی بھی آپ سے رہتا بھلا اندوہگیں یوں ہے
کروں میں کیا کہ قسمت میں مری اے ہم نشیں یوں ہے

اسے چھیڑا صبا نے کوئی پوچھے کیا کیا ہم نے
ہوئی برہم جو ہم سے تیری زلفِ عنبریں یوں ہے

نہ کر جانے کی جلدی جائیو جاناں کو آنے دے
اگر تیرا ارادہ آج اے جانِ حزیں یوں ہے

برنگِ نقشِ پا ہم مرٹیں گے پر نہ اٹھیں گے
ترے کوچے کی پکڑی اب تو ہم نے بھی زمیں یوں ہے

اگر ہے نالہ کش بلبل تو گل کا چاک ہے سینہ
ظفر عالم محبت کا کہیں یوں ہے کہیں یوں ہے

گزر تاریخ یاں کیا کیا نہیں ہے | تجھے کچھ بھی خبر ہے یا نہیں ہے
جو یہ سچ ہے کہ دل کو دل سے ہے راہ | تو قاصد کی بھی کچھ پروا نہیں ہے
نہ کر تو خانۂ دل کی خرابی | کہ گھر تیرا ہے یہ میرا نہیں ہے
بھلائی کر کہ تیرا بھی بھلا ہو | برائی کا ثمر اچھا نہیں ہے
نہیں احوال میرا کس کو معلوم | مگر تجھ سے کوئی کہتا نہیں ہے
رقیبوں کی شرارت ہے وگرنہ | ظفر وہ شعلہ خو ایسا نہیں ہے

لگ گیا تھا جن دنوں کنجِ قفس میں اپنا دل | ہم کو اے صیاد کچھ پروا رہائی کی نہ تھی

دل سے غارت گر کے ہاتھوں کیا کہوں کیا کیا ہوا | دل گیا اور ساتھ دل کے دیں گیا دنیا گئی

عیب و ہنر نہ پوچھو تم آدمی میں کیا ہے | تم میں بھی کچھ نہ کچھ ہے پیارے ہمیں میں کیا ہے

دونوں میں ہم کو یکساں جانے بلا ہماری   افسردگی میں کیا ہے اور خرمی میں کیا ہے
ہیں خاک سے نکلتے رنگیں ہزار ہا گل   کیا جانے یہ دفینہ یارب زمیں کیا ہے [1]

وہ مرغ ناتواں صیاد کیا نالہ کرے جس کا   ہوا ہوتا ہے دم گر دم بھی زیرِ دام لیتا ہے

دل اپنا لگ گیا کنجِ قفس میں اب کسے پروا   بہار آئے چمن میں ہمصفیر و یا خزاں آئے

---

[1] زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف   قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا   (آتش)

مخمس

جب تری شمشیر سے کتنے ہی سر اڑ جائیں گے
رنگ سب کے باعثِ خوف وخطر اڑ جائیں گے
ہم نہیں وہ جن کے اوساں دیکھ کر اڑ جائیں گے
اور تو دھمکی میں اے بیداد گر اڑ جائیں گے
پر نہیں ٹلنے کے ہم ٹکڑے اگر اڑ جائیں گے

ہمصفیر واب تو میں پھندے میں اس کے پڑ چکا
لاکھ پھڑکوں پر نہیں ممکن کہ اس سے ہوں جدا
پوچھو اس ظالم سے تو مقراض کیوں ہے ڈھونڈتا
پر کترنے کا مرے صیاد کو ہے فکر کیا
دام ہی کی کشمکش سے میرے پر اڑ جائیں گے

صبحِ گلشن میں صبا تیرا گر ہو وے گزر
کہیو بلبل سے ذرا اتنا کہ اے شوریدہ سر
کر رہی ہے چہچہے کیا شاخ گل پر بیٹھ کر
یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

بات جو کرتے نہیں ہرگز فریب ومکر بن
تو ہوا خواہی کا دعویٰ معتبر ان کی نہ گن
گل کھلے گا جب کہ ہوگا کوئی ان کا ممتحن
لوگ باغِ سبز دکھلاتے تو ہیں پر ایک دن
ہاتھ کے طوطے سے ان کے اے ظفر اڑ جائیں گے

دوہے

میں کہتی تھی اپنے پیا کو راکھوں گی میں گھیر
وہ تو ایسے بن کو سدھارے پل ہی نہ لاگی دیر

پیم نگر کی ریت نرالی اور نرالے طور
ہے تو وہ اس جگ میں لیکن ہے وہ جگ ہی اور

ہم نہ جانیں کیسی مسجت اور کیسا ٹھاکر دوارا
ہمتو انہی سیس نوائیں جیتے اپنا پیارا

نام ونشاں کی ہی وہ گرمی جن کے محلاں باڑی
پہنچے فقیر اللہ کے گھر تو جس دم کملی جھاڑی

پی کے بلائن جائیں گے جس دن پی کے پاس
اس دن کیسی ہووے گی مینو یہی ہراس

سنگ سنگاتی سنگ نہ ہوں گے ہوگی اکیلی جان
نفسی نفسی سب کہیں گے کس کو کس کا دھیان

کفن سمجھ لو گوڈری اپنی گور سمجھ لو گاؤں
لحد سمجھ لو بستر اپنا خاک سمجھ لو ناؤں

دل کی لاگ نے پہنچائی ہے پاس پیا کے پاتی
کون چلے اس اوگھٹ گھاٹی کس کی ایسی چھاتی

شوق رنگ انسان ظاہر میں تو ہے ماٹی کی مورت
لیکن ہے یہ مورت اپنے صورت گر کی صورت

شہر آشوب

کیا پوچھتے ہو کجروئ چرخِ چنبری   ہے اس ستم شعار کا شیوہ ستمگری
کرتا ہے خوار تر انھیں جن کو ہے برتری   اس کے مزاج میں ہے یہ کیا سفلہ پروری
کھائے ہے گوشت زاغ فقط استخواں ہما
کیا منصفی ہے زاغ کہاں اور کہاں ہما

بالعکس ہیں جہاں میں جہاں تک ہیں کاروبار   شیوہ کیا ہے الٹا زمانے نے اختیار
ہے موسم بہار خزاں اور خزاں بہار   آئی نظر عجب روشِ باغ روزگار
جو نخل پر ثمر ہیں اٹھا سکتے سر نہیں
سرکش ہیں وہ شجر کہ ہے جن میں ثمر نہیں

بادِ صبا اڑائے چمن میں ہے سر پہ خاک   ملتے ہیں دمبدم کف افسوس برگِ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک   کرتی ہیں بلبلیں یہی فریاد درد ناک
شاداب حیف خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خوار نخلِ مغیلاں نہال ہوں

جائیں نکل فلک کے احاطہ سے ہم کہاں ہووے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم کہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زنداں پہ آسماں چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں
جو آگیا ہے اس محلِ تیرہ رنگ میں
قیدِ حیات سے ہے وہ قیدِ فرنگ میں

یہ گنبدِ فلک ہے عجب طرح کا قفس طاقت نہیں ہے نالے کی بھی جس میں یک نفس
جنبش ہو ایک پر کی تو پر ٹوٹ جائیں دس رہ جائے دل کی دل میں نہ کس طرح سے ہوس
کیا طائرِ اسیر وہ پرواز کر سکے
جس میں نہ اتنا دم ہو کہ پرواز کر سکے

کیا کیا جہاں میں ہو چکے شاہانِ ذی کرم کس کس طرح سے رکھتے تھے ساتھ اپنے وہ حشم
آخر گئے جہاں سے تنہا سوئے عدم دارا کہاں کہاں ہے سکندر کہاں ہے جم
کوئی یہاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے
کچھ اے ظفر رہے تو نکوئی یہاں رہے

دوہے

تجھ بن رین اندھیری میں جو مارے آوے تارے
سارے تارے دھوئیں کے مارے ہو گئے کارے کارے
پیم نگر کی گھٹی ہے گھاٹی کون ادھر کو جاوے
میری ڈگر پر جو کوئی آوے وہ ہی رستہ پاوے
چاند سورج کی آنکھوں میں کدھو نہ اتنا نور
جھلکا نور پیا کا میرا دیکھ آنکھوں کے حضور
پیم نگر کی پینٹھ لگی ہے دلالی سب نے ماری
سودا بارہ باٹ نہ کچھ تو ہے دیکھ اتاری

مرثیہ

اسے مجرا جو شاہِ دو جہاں ہے
جھکا مجرے کو جس کے آسماں ہے
وہ سرورِ ہیں شاہِ شہیداں دو جگ کا اجیارا   اللہ کا محبوب ہے وہ اور ہے وہ نبی کا پیارا
علی کا ہے جگر زہرا کی جان ہے

ستم ہے ساقی و کوثر کا جانی
نہ پائے تین دن اک بوند پانی
پانی کی اک بوند نہیں اور سوکھی جائے زبان   مارے پیاس کے گرمی کے ہونٹوں پر آئی جان
لبوں پر پھیرتا سوکھی زباں ہے

موا دن بیاہ کے قاسم جورن میں
جدائی ہوگئی دلہا دلہن میں
کیسی مہندی عطر سہاگ اور کیسی رنگیلی رات   دولہا کے تو ہاتھ کٹیں اور دولہن ملتی ہات
غم قاسم ہے یہ شادی کہاں ہے

گرا اکبر تو برچھی رن میں کھا کر
موا عباس بھی دریا پہ جا کر
مارے گئے سب سنگاتی اکبر اب نرا سے   خیمہ جلا گھر بار لٹا اور اہلِ حرم سب پیاسے
جدھر دیکھو ادھر شورِ فغاں ہے

گئے اصغر کو شہ گودی میں لے کر
کہ پانی سے کروں اس کا گلو تر
پیاسے گلے میں اس کے اتری ہے تیر کی بوند دیکھ کے اس نے باپ کی صورت آنکھیں لینی موند
گلوئے خشک چشمِ خونچکاں ہے

لہو میں دیکھ کر بھائی کو غلطاں
کہا زینب نے یہ باچشمِ گریاں
ہے ہے جس کو پیار سے اپنے زہرا گودی پالے اس کے تن پر گھاؤ لاگے بہتے لہو کے نالے
سراب اس کا ہے اور نوکِ سناں ہے

جسے زہرا نے گودی میں کھلایا
نبی نے دوش پر جس کو چڑھایا
چاروں اور سے اس کے لاگے برچھی بھالے تیر ماٹی اوپر لوٹے رن میں گھائل سارا شریر
لہو کا زخم سے دریا رواں ہے

ہوا زین العبا محبوس افسوس
پیادہ پا چلا افسوس افسوس
جس کے پاؤں کی ماٹی ہو چاند سورج پر فوق اس کے ہاتھوں ہتھکڑیاں ہوں اور گلے میں طوق
سفر درپیش ہے اور ناتواں ہے

ظفر اس غم سے اک عالم ہے مغموم
زمیں سے تا فلک ماتم کی ہے دھوم
نیلا تا گا اکاش نے کینو جانی اندھیری رات تارے یا ہیں آنسوؤں سے ہے بھرے زمانہ نین
جسے دیکھو غرض ماتم کناں ہے

بھجن

جن گلین میں پہلے دیکھیں لوگن کی رنگ رلیاں تھیں
پھر دیکھا تو ان لوگاں بن سونی پڑی وہ گلیاں تھیں

ایسی آنکھیاں میچے پڑے ہیں کروٹ بھی نہیں لے سکتے ہیں
جن کی چالیں البیلی اور چلنے میں چھل بلیاں تھیں

خاک کا ان کا بستر ہے اور سر کے نیچے پتھر ہے
ہائے وہ شکلیں پیاری پیاری کس کس چاؤ سے پلیاں تھیں

جاتا ہے سو آتا نہیں ہے، آتا ہے سو جاتا ہے
جب یہ وہ سن لیتے تھے تو پڑتیں کیا کھلبلیاں تھیں

تلخی اٹھائی موت کی چکھ کے خاک سب ان کو چاٹ گئی
جن کی باتیں میٹھی میٹھی مصری کی سی ڈلیاں تھیں

روز بہاراں لوٹتے تھے وہ جا جا کر جن باگن میں
شوق رنگ اب جو دیکھا واں نا پھول ہیں اور یہ کلیاں تھیں

قطعہ تاریخ ترتیب دیوان

یہ دیوان رشکِ گلشن کیوں نہ ہو گلہائے مضموں سے
کہ اس کا جو ورق ہے سو خیابانِ معانی ہے
ظفر یہ بے تامل مصرعۂ تاریخ لکھ کر اس پر
مرا اب یک قلم دیوان بستانِ معانی ہے

۱۲۴۴ ھ

دیوان دوم

جائے گی نکل جان مری دیکھ کماندار — تیر اپنا اگر تو نے مرے دل سے نکالا
بازار محبت میں نہ دل بیچ تو اپنا — بک جاتا ہے ساتھ اس کے ظفر بیچنے والا

گرفتاری نصیبوں میں نہ ہوتی تو چمن سے میں — بھلا اس طرح کیوں صیاد زیر دام آجاتا
تری دولت سے ہوتے ساقیا جمشید دوراں ہم — اگر اس دور میں ہاتھ اپنے کوئی جام آجاتا

مئے عشرت نہیں طالع میں اپنے ساقیا ورنہ — فلک مینا لیے پھرتا ہے مہ ساغر لیے پھرتا
برنگ نالۂ زنجیر میں زنداں میں ہوں لیکن — مجھے دیوانہ پن زنداں سے ہے باہر لیے پھرتا

تجھے کیا گر ہنسا گل گریۂ شبنم پہ گلشن میں — طمانچہ اس کے منھ پر تو نے اے بادِ صبا مارا

غریق بحر محبت پہ تیرے کیا گزری — کسی سے سننے میں یہ ماجرا نہیں آتا

دے کے دل جاں کو بچاؤ نہیں ہوجائے گا ضبط — اب تو دینا ظفر اس جنس کا محصول پڑا

کرتا تھا جو یاں آنے کا جھوٹا کبھی اقرار — مدت سے ظفر اس نے وہ اقرار بھی چھوڑا

پہلے تو ہم کو تری عشوہ گری نے مارا　　اوراگر اس سے بچے کم نظری نے مارا
خوب پھڑکائے مجھے کنج قفس میں صیاد　　شوقِ پرواز سے بے بال و پری نے مارا
ہمسری کی تری رفتار سے جب فتنہ نے　　قہقہہ طنز سے اک کبک دری نے مارا
شفق صبح سے ہے غرق بخوں چرخ ظفر　　تیر ایسا تری آہِ سحری نے مارا

جا سکے گلشن تلک اڑ کر نہ ہم بے بال و پر　　ہم نے اے صیاد کیا پایا رہائی میں مزا

ہم اپنے کنج غم میں نالہ وفریاد کرتے ہیں　　ہمیں کیا گر چمن میں چہچہا ہے عندلیبوں کا

چھوڑنے کا نہیں غم دل میں ظفر صبر وقرار　　مال اس چور نے بے طرح یہ گھر میں تا کا

آدمی کو چاہیے آدم شناسی اے ظفر　　ہے یہ فرمودہ ہمارے حضرت تیمور کا

اے تصور تو ہی اس جان جہاں تک جائے گا　　اور تو کوئی نہیں ایسا جو واں تک جائے گا
جب کرے گا آہ اے ظالم ترا یہ تفتہ جاں　　اٹھ کے اک شعلہ جگر سے آسماں تک جائے گا
جا کے کعبہ کیا کرے گا تیسرا عاشق اے صنم　　وہ اگر جائے گا تیرے آستاں تک جائے گا
جانے دو جاتا ہے گر عمر رواں کا کارواں　　ٹھہر جائے گا کہیں آخری کہاں تک جائے گا
دام سے صیاد مرغ ناتواں چھوٹا تو کیا　　یہ نہیں امید اڑ کر آشیاں تک جائے گا
کون ہے قاصد ظفر ایسا بجز اشک رواں　　لے کے جو پیغام دل اس دلستاں تک جائے گا

اے جنوں توڑ کے زنجیر در زنداں کو　　جی میں ہے کھائیے اب چل کے بیاباں کی ہوا
دم ہوا ہوتا ہے مرغان قفس کا صیاد　　جب قفس میں کبھی آتی ہے گلستاں کی ہوا

پوچھے ہے اہل حکومت سے فلک بعد از فنا
تھا تمہارا وہ جو دور حکمرانی کیا ہوا

نباہ بات کا اس حیلہ گر سے کچھ نہ ہوا
ادھر سے کیا نہ ہوا پر اُدھر سے کچھ نہ ہوا

ہمیشہ فتنے ہی برپا کیے مرے سر پر
ہوا یہ اور تو اس فتنہ گر سے کچھ نہ ہوا

جلا جلا کے کیا شمع ساں تمام مجھے
بس اور تو مرے سوز جگر سے کچھ نہ ہوا

شب وصال میں بھی میری جان کو آرام
عزیز دور وجدائی کے ڈر سے کچھ نہ ہوا[1]

نہ دوں گا دل اسے میں یہ ہمیشہ کہتا تھا
وہ آج لے ہی گیا اور ظفر سے کچھ نہ ہوا

ہوا بہار کا گر جوش تو یقیں ہے ہمیں
جنوں بھی دست وگریباں ضرور ہم سے ہوا

بتوں کے حق میں محبت سے ہم نے کیا نہ کہا
مگر خدا نے بڑی خیر کی خدا نہ کہا

سب آشناؤں نے دیکھے مرے رواں آنسو
پہ واں کسی نے بھی اس سے یہ ماجرا نہ کہا

کہا تھا تجھ سے جو احوال ہم نشیں ہم نے
خبر نہیں کہ کہا اس سے تو نے یا نہ کہا

مری نگہ نے مرا راز کہہ دیا اس سے
بھلا ہے گر نہ کہا میں نے مدعا نہ کہا

وہ حال دل جو سنے گوش دل سے تو کہیے
وگرنہ کہنے سے کچھ فائدہ کہا نہ کہا

ہم اس کی بات کے قائل ہیں اے ظفر جس نے
بھلا کہا جسے منہ سے اسے برا نہ کہا

ظالم ترے چپ رہنے کا عقدہ نہیں کھلتا
کیا جانے کہ ہے دل میں ترے کیا نہیں کھلتا

جب تک ہو دم سرد و رخ زرد نہ غماز
ہر ایک پہ رازِ دلِ شیدا نہیں کھلتا

اس مست مے ناز کی اللہ رے تمکیں
وہ عالم مستی میں بھی اصلاً نہیں کھلتا

کھلتا نہیں احوال پریشانی دل کا
جب تک کہ ستمگر تیرا جوڑا نہیں کھلتا

بند آنکھیں ہوئی جاتی ہیں مشتاق کی تیرے
کیوں بند نقاب رخ زیبا نہیں کھلتا

---

[1] وصل میں ہجر کا دھڑکا جو لگا رہتا ہے
شام سے پھرتی ہے آنکھوں میں مری صورت صبح
(آتش)

جو اس کو پڑھاتے ہیں وہ جب تک کہ نہ آئیں　　خط سامنے اس شوخ کے میرا نہیں کھلتا
کیا منہ ہو کہ ہو خنجر قاتل کی شکایت　　یاں منہ ہی مرے زخم جگر کا نہیں کھلتا
یاں آئے کہاں سے ہیں کہاں جائیں گے یاں سے　　حیراں ہیں ظفر ہم یہ معما نہیں کھلتا

جب تھا ساقی یار ہمارا ہم تھے اور میخانہ تھا
اب وہ کہاں دن کیفیت کے وہ بھی ایک زمانہ تھا

دشت میں تھا جو خار زباں پر اس کی مرا افسانہ تھا
مجھ سے مقابل ہوتا مجنوں ایسا کیا دیوانہ تھا

جب سے بسا تو دل میں آکر ہوئی ہے صورت آبادی کی
رہتا تھا کون آگے اس میں یہ تو اک ویرانہ تھا

چاہیے تھا اے ناوک افگن دل پہ لگانا تیر نگاہ
چھوڑ دیا کیوں اس کو تو نے یہ تو خوب نشانہ تھا

پوچھتے کیا ہو مجھ سے عزیزو حال غم تنہائی کا
میں تھا اور غم خانہ تھا غمخوار غم جاناں نہ تھا

بل بے تپ اندوہ محبت اف اے گرمیٔ داغ فراق
دل تھا کیا پہلو میں ہمارے گویا آتش خانہ تھا

حسن و جمال یار ظفر جب رات کو بزم افروز ہوا
شمع رخ پرنور پہ اس کے ماہ بھی اک پروانہ تھا

جب سنا آکر قریں وہ زیب محفل پھر گیا　　محفل عیش و طرب سے بس مرا دل پھر گیا
کل دیا تھا جس کو تو نے لاکھ ذلت سے نکال　　آج کوچے میں ترے وہ تیرا مائل پھر گیا
بوالہوس آتا تھا میرے ساتھ راہِ عشق میں　　اے ظفر دیکھی جو اس نے سخت منزل پھر گیا

ٹھہرا ہوا جو پاؤں ٹھکانے سے اٹھ گیا
دل بھی قسم ہے ایک زمانے سے اٹھ گیا
توڑی مریضِ غم نے ترے اس طرح سے جان
گھبرا کے غمگسار سرہانے سے اٹھ گیا
وہ تھا جو مہرومہ کے لیے اعتبار نور
سب تیرے ایک جلوہ دکھانے سے اٹھ گیا
تھا کس کا تجھ کو پاس کہ تو میرے پاس سے
محفل میں بیٹھے بیٹھے بہانے سے اٹھ گیا
وہ جانتا تھا مجھ سا نہیں ہے کوئی حسین
میرے سوائے حسن زمانے سے اٹھ گیا
ہم صورت اپنے اس کو جو آئے کئی نظر
حیران ہو کے آئینہ خانے سے اٹھ گیا
تھا میرے اور اس کے جو پردہ سا اک ظفر
یکبارگی دوئی کے اٹھانے سے اٹھ گیا

جس کو ڈھونڈتا ہوا میں ہر کہیں گیا
دل ہی میں تھا مرے وہ مجھے مل یہیں گیا
آنکھیں سی کھل گئیں مہ وانجم کو دیکھ کر
کوٹھے پر اپنے تو جو شب اے مہ جبیں گیا
چونکا نہ خواب گاہ میں شب کو وہ مستِ ناز
شور فغاں مرا سرِ چرخ بریں گیا
میں اور دوں دل اپنا کسی کو ترے سوا
تیرا خیال یہ کدھر اے نازنیں گیا
کنج لحد میں بھی مجھے آرام ہو چکا
گر ساتھ مضطرب دل اندوہگیں گیا
آیا رقیب بن کے وہاں سے وہ اے ظفر
پیغامبر جو ہو کے مرا ہم نشیں گیا

سینے میں اک دھواں کئی بار اٹھ کے رہ گیا
نکلا نہ میرے دل کا بخار اٹھ کے رہ گیا
پہلو میں میرے رشک سے کیا کیا اٹھا نہ درد
پہلو سے غیر کے جو وہ یار اٹھ کے رہ گیا
آیا نہ میرے دیدۂ گریاں کے سامنے
سو بار دیکھا ابر بہار اٹھ کے رہ گیا
دیتا جلا فلک کو مگر خیر ہوگئی
ساتھ آہ کے جو دل سے شرار اٹھ کے رہ گیا
تیری گلی سے جا نہ سکا اٹھ کے یہ نحیف
تھا ایک ناتواں سا غبار اٹھ کے رہ گیا
پکڑے جو خار دشت جنوں نے ہمارے پاؤں
اپنا قدم ظفر سرِ خار اٹھ کے رہ گیا

کھل گئیں آنکھیں سی انجم کی جو شب کو وقت خواب
منہ دوپٹے سے ترا اے ماہ پیکر کھل گیا

اسے کیا غوطے کھائے ہم نے گر بحر محبت میں — کہو ناصح سے جائے یہ کہاں کا آشنا آیا
اسیرانِ قفس کا دم ہوا ہوتا ہے حسرت سے — چمن سے کیا کوئی جھونکا نسیم صبح کا آیا

اے ظفر چاہے خرابی تیری جو خانہ خراب — کردے اس کو تیرا اقبالِ شہنشاہی خراب

ہو رہے گا کششِ دل کا اثر آپ سے آپ — کھینچ کے آجائیں گے اک دن وہ ادھر آپ سے آپ
وہ کہیں ہو کوئی چھپتا ہے مری آنکھوں سے — ڈھونڈھ لیتی ہے اسے میری نظر آپ سے آپ
نہیں کھلتا ہمیں کس غنچہ دہن کا ہے خیال — یوں جو ہم رہتے ہیں چپ دو دو پہر آپ سے آپ
دل پہ کچھ صدمہ غم عشق نے پہنچایا ہے — چشم رہتی نہیں اشکوں سے یہ تر آپ سے آپ
ایسے غفلت کدہ میں آئے کہ ہم بھول گئے — تھے کہاں اور چلے آئے کدھر آپ سے آپ
لب شمشیر سے کیا مژدہ سنا اے قاتل — ہنس رہا ہے جو مرا زخم جگر آپ سے آپ

کام ہے وقت پہ موقوف جب آجائے ہے وقت
تو وہ ہو جائے ہے اس وقت ظفر آپ سے آپ

تیری یاری میں گیا سب ہم سے یاروں کا ملاپ — ایک ملنے سے ترے چھوٹا ہزاروں کا ملاپ
رنج و غم دونوں یہ مدت سے ہیں میری غمگسار — ترک مجھ سے کیوں کہ ہو ان غمگساروں کا ملاپ

ہے کہاں خواب کہ وہ خواب میں تجھ کو دیکھے — کٹے آنکھوں میں ہے حسرت کش دیدار کی رات
گذری اس طرح سے غفلت میں جوانی اپنی — جیسے مستی میں گزر جائے ہے میخوار کی رات

ہوا ہے، ابر ہے اور سیر سبزہ زار بسنت — شگفتہ کیوں نہ ہو دل دیکھ کر بہار بسنت
کہاں ہے ساغر یاقوت زرد میں مئے سرخ — بہار گل ہے ہم آغوش ہمکنار بسنت
خبر بسنت کی بھی کچھ تجھے ہے اے ساقی — پیالہ بھر کہ ہے پھر آمد بہار بسنت
ہوا جو وہ گل رنگیں ادا بسنتی پوش — تو اور باغ جہاں میں بڑھا وقار بسنت

سمجھ نہ صحن چمن میں اسے گل نرگس — جھکی ہوئی ہے ظفر چشم پرخمار بسنت

ہیں یہاں رنج کے آثار خوشی کے باعث — اشک آنکھوں سے ٹپکتے ہیں ہنسی کے باعث
تم جو غصے ہو تو غصہ مرے سر آنکھوں پر — پر بشرطیکہ نہ ہو اور کسی کے باعث

چھوٹا بھی قفس سے تو کہاں طاقت پرواز — ہے مجھ کو بڑا اپنی رہائی کا غم ورنج
اس در پہ نہیں مجھ کو رسائی تو بلا سے — لیکن ہے رقیبوں کی رسائی کا غم ورنج

تیرا دیوانہ جو زنداں سے نہ نکلا اب تک — پڑ گیا پاؤں میں کچھ ایسا ہی زنجیر کا پیچ

آئے تم اس دم کہ جس دم آ گیا آنکھوں میں دم — میں نے دیکھا بھی نہ تم کو میری جاں اچھی طرح
اتنی بھی فرصت نہ دی ہم کو فلک نے اے ظفر — کرتے اس کوچے میں ہم آہ وفغاں اچھی طرح

رخصت سیر چمن گر نہیں دیتا صیاد — رکھ دے پر گل کوئی میرے قفس دام میں شاخ

رخصت پرواز گر صیاد تو دیتا ہمیں — ہم چمن میں پہنچتے باد سحر سے پیشتر
عرصۂ ہستی سے تنگ اتنا کہ جب ہوں گرم رو — یک نفس میں ہم گزر جائیں شرر سے پیشتر

نالۂ مرغ گرفتار میں تاثیر کہاں — ورنہ ہو ایک نفس میں دل صیاد گداز
چشم نم دیدہ نہیں ہوں میں ستم سے تیرے — ہے طبیعت ہی میری اے ستم ایجاد گداز
ہمسر ہوں میرے نالہ سے کیا نالہ ہائے نے — اس میں ظفر یہ سوز کہاں اور کہاں گداز

دکھا دیا تھا ظفر ہم نے داغ دل اک دن — فلک پہ خوف سے کانپے ہے آفتاب ہنوز

دل کا زلفوں سے مرے سہل ہوایوں سودا جیسے سستی کوئی بک جائے ہے نیلام کی چیز

اے گرفتاری تری دولت سے تا قید حیات جائے گی اپنے تصرف سے نہ جاگیر قفس
کنج غم کی اپنے جو صورت ہے کیا بتلائیں ہم کھینچ کر جب تک کہ دکھلائیں نہ تصویر قفس

اے ظفر صاحب غرض سے بھاگتے ہیں لوگ دور اس زمانے میں کہیں جاؤ تو جاؤ بے غرض

جو پائی بزم میں ساقی تری جگہ خالی بھر آیا دیکھ کے دل ساغر و سبو کی طرف
نہ اس کی بزم میں آنسو بہائیو اے چشم نگاہ رکھیو ذرا میری آبرو کی طرف

تھا نہ جب تک صنم ہوش ربا سے واقف حق ہے واللہ نہ تھا بندہ خدا سے واقف
جانتی سب سے ہے لگ چلنے کے شیوے دنیا پر نہیں ایک رہ و رسم وفا سے واقف
نہیں معلوم کہ ہے کحل جواہر کیا چیز ہم ہیں اس یار کی خاک کف پا سے واقف
جو مجھے کہتے ہیں دل اس کو دیا کیوں تو نے نہیں اس شوخ کی وہ ناز و ادا سے واقف
میں ہوں بیمار محبت نہ کرو میرا علاج اے طبیبو نہیں تم میری دوا سے واقف
ہنستے کیوں گل کی روش باغ جہاں میں غافل
اے ظفر ہوتے اگر یاں کی ہوا سے واقف

کم ہو اندیشہ اگر کم ہو مآل اندیشی جتنا دانا کو ہے اتنا نہیں نادان کو خوف

وصال بھی جو میسر ہوا تو خوش نہ ہوا غمِ فراق کے ڈر سے یہ مبتلائے فراق

گو نہ زباں سے کہا راز محبت تو کیا خشک ہے لب چشم تر زرد ہے منہ رنگ فق

اپنے بیمار محبت کی عیادت کے لیے
تو جو آتا تو نہ آتا تری کچھ شان میں فرق

اے جنوں ہاتھ سے تیرے نہ رہا آخر کار
چاک داماں میں اور چاک گریبان میں فرق!

جام کوثر کو بھی وہ منھ نہ لگاوے ساقی
جس کے ہو لب کو لگی جام مئے ناب سے لاگ

آنکھ اس رخ سے لگی یوں مری جیسے لگ جائے
گل خورشید کی خورشید جہاں تاب سے لاگ

واللہ بتوں نے ہم سے یاری کی ترک
پر ہم نے نہ ان کی پاسداری کی ترک

ہم خاک میں مل گئے بلا سے لیکن
اس در کی نہ ہم نے خاکساری کی ترک

دیتا نہیں تو جام تو ساقی ہم نے
لے آج ہی سے شراب خواری کی ترک

سو بار خفا ہوئے نہ چھوڑا ملنا
کیوں آمد و رفت اب کی باری کی ترک

کچھ آپ نے قدر جاں نثاروں کی نہ کی
اس پر بھی نہ ہم نے جاں نثاری کی ترک

میں غم ہی کو جانتا ہوں اپنا غم خوار
یاروں نے تو میری غم گساری کی ترک

سو بار برس کے تھم گیا مینھ لیکن
آنکھوں نے مری نہ اشکباری کی ترک

دشمن گیا اپنا اک جہاں کو ہم نے
لیکن نہ تمہاری دوستداری کی ترک

جس دن سے کہ دم تری محبت کا بھرا
اکدم نہ ظفر نے آہ وزاری کی ترک

جب کہ دل ہی نہ ملے ماہ جبیں کیا حاصل
ساتھ شکووں کے چناں اور چنیں کیا حاصل

اے کماندار نہ سینے سے مرے تیر نکال
جائیگی ساتھ نکل جاں حزیں کیا حاصل

دل و جاں دینے میں انکار کسے ہے لیکن
جب محبت کا نہیں تم کو یقیں کیا حاصل

! اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

(میر)

نہ کوہ کن سے ملے دل مرا نہ مجنوں سے　　　نہیں کسی سے بھی اس خانماں خراب کا میل

دیکھیے کیا رنگ ہوگا جب کہ آئے گی بہار　　　ڈھنگ ابھی سے دیکھتے ہیں اور کچھ وحشت کے ہم

کیا کسی سے خاک ہوں وحشت میں اب مانوس ہم　　　دیکھتے ہیں اپنے سائے کو تو رم کرتے ہیں ہم

آہ وفغاں یا نالے پیہم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں
ہم کو کیا تنہائی میں ہم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں
وہ بے پروا ان کی بلا سے کوئی جئے یا کوئی مرے
ظلم وستم عشاق پہ ہردم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں
چاک گریباں، ٹکڑے داماں، بال پریشاں خاک بسر
اپنا جنوں سے ہے یہ عالم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں
کرتے کبھی ہیں جیب دری ہم کرتے کبھی ہیں نوحہ گری
گھر ہے جو تم بن خانۂ ماتم چاہتے ہیں سو کرتے ہیں

جوشِ وحشت کے ہمارے اور ہی کچھ ڈھنگ ہیں　　　رہنے دے گا یہ نہ جنگل میں نہ بستی میں ہمیں

اضطراب دل کے ہاتھوں ہم نحیف وناتواں　　　گرتے پڑتے کوچۂ دلبر میں آ پہنچے تو ہیں

خم کے خم خالی کئے ساقی سے لیکن اب تلک　　　ہم کیے جاتے طلب ساغر پہ ساغر اور ہیں
پیروِ عشق وجنوں کو کیا غرض ہے خضر سے　　　راہ ان کی اور ہے اور ان کے رہبر اور ہیں

تری باتیں تری گھاتیں سمجھ میں کس کے آتی ہیں　　　انھیں تو کچھ ہمیں اے شوخ بے پروا سمجھتے ہیں

میری طرف سب تاک رہے ہیں محفل میں ہیں جتنے حریف
ساقی تجھ سے ساغر مے میں آنکھ بچا کر کیوں کرلوں

عالمِ صورت میں تو میں صورت آدم میں ہوں — عالمِ معنی میں لیکن اور ہی عالم میں ہوں
کام ہے رونے سے مجھ کو رات بھر مانند شمع — خواہ بزم عیش میں ہوں خواہ بزم غم میں ہوں
بعد میرے کون ہوگا ایسا غم کا غمگسار — غم زدہ غم ہوگا میرے غم میں، میں اس غم میں ہوں
مجھ سے کیوں الجھے ہے تو ناصح کہ میں الجھا ہوا — آ گئے ہی اس کے خیال گیسوئے پُرخم میں ہوں
بڑھتے بڑھتے دل تلک پہنچا ظفر زخم جگر — اور میں ابتک تلاش نسخۂ مرہم میں ہوں

ہوا میں قتل لیکن تو نہ ہو بدنام ڈرتا ہوں — ترا جو نام اے بیدادگر لوں کس طرح سے لوں

پھر گئی اک بار ایسی باغ عالم کی ہوا — بولتے وہ بولیاں بھی جانور اگلی نہیں
ہوگیا معلوم اندازِ سخن ہی سے مجھے — وہ عنایت ان کی میری حال پر اگلی نہیں

پڑے ہیں تیرے کوچے میں مثال نقش پا لاکھوں — کہے تو ہم بھی کرلیں اپنا بستر ایک گوشے میں
ظفر میخانۂ دنیا کی کیفیت وہ کیا جانے — پڑا زاہد تو ہے مسجد کے اندر ایک گوشے میں

نصیب ہو نہ ان آنکھوں کو نور بینائی — ترے سوا جو کسی اور مہ جبیں کو تکیں

صیاد نے آزاد کیا مجھ کو قفس سے — طاقت نہ رہی اڑنے کی جب میرے پروں میں

میرے دل کی سوزش کو کب اشک بجھانے والے ہیں
بلکہ یہ تو اورزیادہ آگ لگانے والے ہیں

یاد کرو گے ہم کو جب ہم اٹھ جائیں گے دنیا سے
ملتے کب تقدیر سے ایسے ناز اٹھانے والے ہیں

اس بت کی بیوفائی اگر ہے یہی تو ہم ڈھونڈیں گے کوئی اور صنم کل میں آج میں

واقف ہیں ہم کہ حضرت غم ایسے شخص ہیں اور پھر ہم ان کے یار ہیں ہم ایسے شخص ہیں
یوں تو بہت ہیں اور بھی خوبانِ دلفریب پر جیسے پرفن آپ ہیں کم ایسے شخص ہیں

قطعہ

وہ ہم سے وعدہ کر جاتے ہیں اکثر شب کے آنے کا
مگر آتے نہیں ہرگز کہ جا کر بھول جاتے ہیں
گزر جاتی ہے ساری رات کہتے کہتے ہم کو یہ
اب آتے ہیں، اب آتے ہیں، اب آتے ہیں، اب آتے ہیں

ہوتے ہیں تیری بزم میں خوش کب شمع صفت ہم سوختہ جاں
جلتے شام کو آتے ہیں اور روتے سحر کو جاتے ہیں

ظفر یہ بارِ عشق اٹھے نہ اٹھے ہم ضعیفوں سے مگر اک بار اپنی تاب و طاقت آزماتے ہیں

وہ ہیں آوارہ و سرگشتہ صحرائے جنوں میں ہم خضر گمراہ ہوتا ہے جنوں کی رہنمائی میں
اسیرانِ قفس نے آج اپنے بال و پر توڑے ہوا حاصل ٹھہر کر یہ تمنائے رہائی میں

نہیں آئے گی ہرگز بات بھی اس شوخ کے آگے یہ بیٹھے حضرت ناصح یونہی تقریر کرتے ہیں

سوزش دل کو ہیں کیا خاک بجھاتے میری ‏ ‏ ‏ مجھ کو رسوائے جہاں دیدۂ تر کرتے ہیں
آتش عشق سے اڑ جائیں سمندر کے حواس ‏ ‏ ‏ یہ ہمیں ہیں کہ جو اس آگ میں گھر کرتے ہیں

قابو میں اپنے تھوڑے سے وہ آ گئے تو ہیں ‏ ‏ ‏ ان کا مزاج ہم بھی کچھ اب پا گئے تو ہیں
چتون کو خوب چاہ کی پہچانتے نہیں ‏ ‏ ‏ پر دیکھنے سے میرے وہ شرما گئے تو ہیں

چمن میں جب بہار آتی ہے اور غنچے چٹکتے ہیں ‏ ‏ ‏ تو حسرت سے اسیرانِ قفس کیا کیا پھڑکتے ہیں
گیا منزل پہ سارا قافلہ اور راہ غربت میں ‏ ‏ ‏ ہم آواز جرس کی طرح سے تنہا بھٹکتے ہیں
سبب کچھ اس خموشی میں ہے اپنی اے ظفر ورنہ ‏ ‏ ‏ زباں منہ میں ہمارے بھی ہے ہم بھی بول سکتے ہیں[1]

لگ رہے گا کچھ نہ کچھ لگا کسی دن اے ظفر ‏ ‏ ‏ طور کچھ ان سے لگاوٹ کے چلے جاتے ہیں

کسی کو کاہے کو آتی ہے راہ و رسم جاں بازی ‏ ‏ ‏ مگر ہم زندگی سے ہاتھ اپنی دھو کے سیکھے ہیں

ہو نہ ہو تعظیم درد دل مگر ہم مضطرب ‏ ‏ ‏ بارہا اٹھے تو ہیں اور بارہا بیٹھے تو ہیں

عین گریہ میں مرے سینہ و دل ہیں سوزاں ‏ ‏ ‏ دیکھو اس شدت باراں میں یہ گھر جلتے ہیں

رات بھر گرچہ جلی شمع تو کیا خاک جلی ‏ ‏ ‏ عاشق سوختہ جاں آٹھ پہر جلتے ہیں

چمن سے دور رہا اس قدر قفس میرا ‏ ‏ ‏ کہ پہنچی اڑ کے نہ مجھ تک گل چمن کی بو
ہوا ہے صورت دیوانہ گل گریباں چاک ‏ ‏ ‏ چمن میں لائی صبا کس کے پیرہن کی بو

---

[1] ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ‏ ‏ ‏ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی (غالب)

شہید ناز کے ہر زخم سے ہے خون جاری — تمہارا تر نہ ہو دامن کہیں لہو سے ہٹو
جو پیش آئے وہ مستو کرم ہے ساقی کا — نہ پھیرو جام سے منہ اور نہ تم سبو سے ہٹو

میرے سمجھانے کو آئے حضرت ناصح ہیں آج — دیکھیے کیا مجھ کو سمجھاتے ہیں سمجھانے تو دو[1]

زنداں میں کیا پڑے ہو کہے ہے مجھے جنون — تم چند روز سیر بیابان تو کرو

کھینچتے ہی تیر سینے سے جائے گا دم نکل — ایسا نہ ہو کہ تم یہ کہیں تیر کھینچ لو
ہے صبح کوچ حضرت دل جب تلک ہے رات — دو چار اور نالۂ شب گیر کھینچ لو

جاؤ اس بن اگر آرام نہیں تم جانو — حضرت دل ہمیں کچھ کام نہیں تم جانو
چڑھتے نظروں میں ہو لگ جائے کسی کی نہ نظر — بیٹھنا خوب لب بام نہیں تم جانو
قتل کرتا ہے ترا ناز سے کہنا ساقی — کوئی پیتے ہو پیو جام نہیں تم جانو
ابتدا ہی میں ترے ڈھنگ جتاتے ہیں ہمیں — عشق کا جانتے انجام نہیں تم جانو
تم مسلمان ہو ظفر خوب نہیں عشق بتاں — اور اگر یہ ہے تو اسلام نہیں تم جانو

ہاتھ اٹھانے کے نہیں زلف دوتا سے کچھ ہو — ہو چکے ہم تو سیہ بخت بلا سے کچھ ہو

بے وفا تجھ سے شکایت ہے ستم کی بے جا — کیجیے اس سے کہ جو آگاہ وفا سے کچھ ہو
سر رہے یا نہ رہے جان بچے یا نہ بچے — منہ نہ موڑیں گے تری تیغ جفا سے کچھ ہو

---

[1] حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ — کوئی ہم کو یہ تو سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا
(غالب)

ہو چکا بس ترے بیمار محبت کا علاج — نہ تو اب کچھ ہو دوا سے نہ دعا سے کچھ ہو
خاک پہنچے ترے کوچے میں کسی کی کیا خاک — جب تلک اس کی لگاوٹ نہ صبا سے کچھ ہو
تیرے غمزوں سے یہ پوچھوں کہ ہوئے تم سیراب — یا ابھی اور بھی تم خون کے پیاسے کچھ ہو
کہے دیتی ہیں نگاہیں ہی تمہاری سب کچھ — کیا ہو اگر نہیں تم کہتے حیا سے کچھ ہو

نہیں معلوم ظفر ان سے ہوئیں کیا باتیں
چپکے بیٹھے ہوئے تم آج خفا سے کچھ ہو

امنڈ آتا ہے دل جس وقت کب روکے سے رکتا ہے
مجھے رہنے دو یارو میرے آنسو پونچھتے کیوں ہو

اور زیادہ بھڑکاتے ہو تم تو آگ محبت کی
سوزش دل کو اے اشکو کیا خاک بجھانا سیکھے ہو

صورت گر ازل نے جو کھینچی تری شبیہ — آپ اپنے اس نے چوم لیے اے نگار ہاتھ

تماشا آکے اس صورت کدہ میں اس نے کیا دیکھا
کہ اتنی صورتوں میں جس نے اک صورت نہ پہچانی

اٹھا کون سا اس بزم سے میکش ساقی — جس کے ماتم میں یہ بادل ہیں سیہ پوش ہوئے
عہد و پیماں تھے مرے ساتھ تمہارے کیا کیا — ہو گیا کیا کہ جو سب تم کو فراموش ہوئے
دل گرفتہ کوئی کیا مجھ سا چمن میں آیا — کہ جسے غنچہ و گل دیکھ کے خاموش ہوئے

گئے آغوش لحد میں ہم اسی حسرت سے
کہ کبھی ہم سے نہ تم آکے ہم آغوش ہوئے

وفور گریہ نے میرے بچالیا ورنہ — جلا چکی تھی مری آہ شعلہ بار مجھے
کھلی ہوئی ہیں مری زیر خاک بھی آنکھیں — کسی کا آہ یہاں تک ہے انتظار مجھے

ہم جہاں سے ہوں گے رخصت جائیں گے جی سے گزر
آپ رخصت ہو کے جب گھر سے ہمارے جائیں گے
کوئی حسرت اے فلک اپنی نکلنے کی نہیں
ساتھ ہی زیر زمیں ارمان سارے جائیں گے

خبر ہے یا نہیں تجھ کو کہ ہر شب تیرے کوچے میں — کوئی دیوار و در د سے اپنا سر ٹکراتا پھرتا ہے

ضعیف و ناتواں ہوں کوچۂ جاناں میں رہنے دے
یہاں پہنچا ہوں میں اے گردش تقدیر مشکل سے

مست کہہ دیتے ہیں دل کی ہو وہ بے جا یا بجا — کیا طریقہ واہ بے باکانہ میخانے کا ہے

عیش سے گزری کہ غم کے ساتھ اچھی نبھ گئی — نبھ گئی جو اس صنم کے ساتھ اچھی نبھ گئی
دوستی اس دشمن جاں نے نباہی تو سہی — گو نبھی ظلم وستم کے ساتھ اچھی نبھ گئی
خوب گزری گرچہ اوروں کی نشاط و عیش میں — اپنی بھی رنج والم کے ساتھ اچھی نبھ گئی

باندھے پر صیاد نے ایسے ہم اڑ سکتے نہیں — ہوگا کیا کھڑکی قفس کی اب اگر کھل جائے گی

ایسے ہی عشق میں گر بے صبر و تاب ہو گے — تو اور بھی ظفر تو رسوا شتاب ہو گے
کیا کیا مزے کی باتیں ہوں گی کہ جب نشے میں — ہم بے حجاب ہوں گے تم بے حجاب ہو گے

جانے دو حضرت دل اس پر نہ شیفتہ ہو　　ناحق کو مبتلائے رنج وعذاب ہو گے

آئینہ سے یونہی تیری آنکھ گر لگ جائے گی　　دیکھنا پھر تجھ کو تیری ہی نظر لگ جائے گی
آج بھی آئے گا تو یا پھر وہی کل کی طرح　　پاؤں میں مہندی ترے اے فتنہ گر لگ جائے گی
جینے دینے کا نہیں ہاں اضطراب دل مجھے　　دیر گر تجھ کو وہاں اے نامہ بر لگ جائے گی
تم جو پوچھو گے کسی سے کوچۂ دلدار میں　　ہم نشینو کچھ نہ کچھ دل کو خبر لگ جائے گی
کیوں لگاتے دل کسی سے ہم اگر یہ جانتے　　جان کے پیچھے بلا اک اس قدر لگ جائے گی
گر یہی ہے آہِ آتش بار تو جائے شفق　　خیمۂ افلاک کو آگ اے ظفر لگ جائے گی

گفتگو ہونے وہاں آٹھ پہر اور لگی　　دل خبردار ہو یہ آج خبر اور لگی
گل جو اس گلشن ہستی میں ہے اتنا ہنستا　　کچھ ہوا ہی اسے اے باد سحر اور لگی
نہ ہوئی گریہ سے کم کچھ بھی تری گرمیٔ دل　　بلکہ اک آگ سی اے دیدۂ تر اور لگی

ناصحا کیوں کر کروں اس آفت جاں سے بگاڑ　　تیرا کیا جائے گا میری جان پر بن جائے گی

تنہا کبھی جو ان سے ملاقات ہوئے گی　　باتیں بھی ہوں گی اور بھی کچھ بات ہوئے گی
مہماں بلا کے غم کو کیا وائے گھر تباہ　　ایسی بھی کیا کسی کی مدارات ہوئے گی
آئے گا خاک ہو کے بھی دامن نہ اس کا ہاتھ　　قسمت تو اپنی ساتھ ہی ہیہات ہوئے گی
ہوں گے جہاں میں یوں تو طرحدار اور بھی　　لیکن یہ چھب کہاں یہ کہاں گات ہوئے گی
ہوتی نصیب سے ہے میسر شب وصال　　جب تک نہ دن پھریں گے نہ وہ رات ہوئے گی
نکلیں گے خانقاہ سے جس وقت پھر وہی　　ہم ہوں گے رند ہوں گے خرابات ہوئے گی
چھپ چھپ کے رات کا نہیں جانا یہ بے سبب　　تم نے ظفر لگائی کہیں گھات ہوئے گی

یار کہتے ہیں مجھے ظاہر نہ کر عشق بتاں | واہ وا آگاہ جب ساری خدائی ہو چکی
عقل راہ عشق میں ہمراہ تو میرے نہ ہو | راہ لے اپنی کہ تجھ سے رہنمائی ہو چکی
کل ظفر بیٹھے تھے بن کر پارسا اور آج پھر | میکدے کا قصد ہے تو پارسائی ہو چکی

بلا سے گر نہیں ہے سایہ بال ہما سر پر | تری دیوار کا سایہ کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیے
مزا جو کچھ کہ اس درد محبت کا ہے بیدردو | وہ ہم سے پوچھتے ہو کیا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیے
ظفر دنیائے فانی خواب کا سا ایک عالم ہے | مگر اس خواب میں دیکھا کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیے

بلا سے خاک ہو جائیں گے جل کر سوزش غم سے | مگر منہ سے نہ اف ہم غم گساروں میں نکالیں گے

نالے ہر چند پرے چرخ کہن کے پہنچے | پر نہ کانوں تلک اس عہد شکن کے پہنچے
وائے ناکامی جاوید کہ وقت آ پہنچا | ہم جو غربت زدہ رستے پہ وطن کے پہنچے
یوں تو دنیا میں ہزاروں ہیں سخنور لیکن | کون رتبے کو ظفر تیرے سخن کے پہنچے

کہاں پرواز کی طاقت نہیں ہیں بال و پر ثابت | قفس میں کیا تمنائے رہائی سوچ کر کیجیے

لگا دے گر نہ مرے منہ سے جام مے ساقی | بلا سے تھوڑی سی ٹپکا شراب منہ پر دے

ڈرتا ہوں موج بحر محبت سے اے ظفر | ہاتھ آتے آتے دامن ساحل ڈبو نہ دے

بات وہ اس سے کرے جو ایک کہہ کر سو سنے | منہ پہ کون اس شوخ کے حاضر جوابی میں پڑے

میں بس میں ہوں صیاد کے وہ دیکھیے مجھ کو | پھڑکا کے تہہ دام بلا مارے کہ چھوڑے

ہنستا ہے تیرے سامنے اس طرح میرا زخم　　جس طرح آشنا سے کوئی آشنا ہنسے

دیکھی نہ تصویر ایک بھی ایسی جیسی تیری صورت ہے　　گر چہ مرقع مانی دیکھا ہم نے سارا آنکھوں سے

پاس گر رکھئے کسی کو پاسداری کیجیے　　ورنہ رہنے دیجیے صاحب سلامت دور کی
شکوہ تھا جب تک کہ تھا پاس محبت کچھ انھیں　　جب نہ پاس ان کو رہا ہم نے شکایت دور کی

صیاد تو نے کردیا آزاد پر ہے ڈر　　پھر کھینچ لائے ہم کو محبت نہ دام کی

برا ہو محتسب کا ایک دن میں کردیئے ویراں　　وہ جو آباد تھے اس شہر میں میخانے برسوں کے

مرگیا پر نہ مسیحا کا ہوا منت کش　　تیرا بیمار مری طرح کوئی ہو تو سکے
ہیں ظفر گرچہ گہر بار ہمیشہ بادل　　لیک خوں بار مری طرح کوئی ہو تو سکے

حیراں سے دیکھتے ہو تم کیا مریض غم کو　　یہ رنج ہو تو کیوں کر صورت بدل نہ جائے
ان روزوں اس گلی میں جاسوس جا بجا ہیں　　کہہ دے کوئی ظفر سے واں آج کل نہ جائے

دے کے اس شوخ ستم گار کو ہم اپنا دل　　جی میں پچھتائے ہیں اپنے کہ یہ کیا کر بیٹھے

بگڑا ہوا یہ حال ہے میرا کہ مصور　　کھینچے مری تصویر اگر بن کے بگڑ جائے

ہوا رنج اس کے دل کو جس سے حال دل کہا ہم نے　　کسی کے سامنے پھر ایسے افسانے کو کیا کہیے

کیئے لاکھوں ستم اس پیار میں بھی آپ نے مجھ پر خدانا خواستہ گر خشمگیں ہوتے تو کیا کرتے

خفا ہوا جو اسیران دام پر صیاد اکھاڑے چار کے پر اور چار کے کاٹے

بلائیں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے بلا یہ کون لیتا جان پر لیتے تو ہم لیتے
اسے کیا کام تھا وہ بے خبر کیوں پوچھتا پھرتا دل گم گشتہ کی اپنے خبر لیتے تو ہم لیتے
نہ لیتا مول سودا کوئی بازار محبت کا مگر کچھ جان اپنی بیچ کر لیتے تو ہم لیتے
کوئی کیا تیرا کرتا نالہ کرتے کرتے مر جاتا جو بدلا تجھ سے چرخ کینہ ور لیتے تو ہم لیتے
نہ ہوتا ہم سے ہم بستر اگر تو تیرا کیا جاتا تڑپ کر کروٹیں یاں رات بھر لیتے تو ہم لیتے
نہ ہوتا کوئی منت کش تری شمشیر کا ہرگز یہ احساں سر پہ اے بیداد گر لیتے تو ہم لیتے

لگایا جام مے ہونٹوں سے اس نے ہم کو رشک آیا
کہ بوسہ اس کے لب کا اے ظفر لیتے تو ہم لیتے

بلا سے خاک عاشق کی اگر برباد ہو جاتی پر اس کوچے میں اے باد سحر پہنچا تو دی ہوتی
مرے احوال سے وہ بے خبر ابتک نہیں واقف کوئی بات اس کے کانوں تک ظفر پہنچا تو دی ہوتی

خدا کے واسطے اے عشق تو ہی کر انصاف کہ اتنا بار الم مجھ سے ناتواں کے لیے
پڑے ہیں سوز محبت سے دل پہ جتنے داغ ستارے اتنے نہ ہوویں گے آسماں کے لیے
بچائے اپنے جو دامن کو خاک عاشق سے تو کوئی خاک ہو خاک ایسے بدگماں کے لیے

ہم کو کیا کام ہے ہم کون شکایت والے کچھ کہیں یا نہ کہیں آپ کی صحبت والے
اک نگہہ پر دل و جان دونوں تجھے دیتے ہیں تیرے عاشق ہیں یہ دل والے محبت والے
شمع رو پردہ اٹھا منھ سے نہ تو بزم میں دیکھ مثل پروانہ جلے جاتے ہیں غیرت والے

ہم نے اس بت میں جو دیکھا ہے نہیں کہہ سکتے　　کہ مبادا کہیں سن پائیں شریعت والے
اس ستم پر تو ظفر دیتے ہو تم دم ان پر　　کیا ستم ہو جو وہ ہوں مہر و مروت والے

کہاں ہیں وہ اگلے ملاقات والے　　عنایات والے مدارات والے
خوش اوقات دیکھے خرابات والے　　ہمیشہ رہے خوش اس اوقات والے
جو دل میں تمہاری وہ ان کی زباں پر　　تمہارے ہیں عاشق کرامات والے
جو دیں ایک گالی بھی سو منتوں سے　　ملے ہیں وہ ہم کو عنایات والے
مرے گریہ سے اب تو بارہ مہینے　　گزرتے مہینے ہیں برسات والے
ہم اک روز دل تحفہ دے آئے ان کو　　وہاں چاہئیں روز سوغات والے
سنو تم جو ان کی نہ طومار باندھیں　　کہ ہیں ہم تو دو بول اک بات والے
ہم اس کو سمجھتے ہیں جو منہ سے کہہ دو　　اشارات جانیں اشارات والے
قیامت پہ کرتے تھے برپا قیامت　　ظفر نالے وہ ہجر کی رات والے

کوئی افسوں میرا گر ان پر چلے　　خود بخود آئیں وہ میرے گھر چلے
یک بیک اٹھا وہیں پہلو میں درد　　جب وہ پہلو سے مرے اٹھ کر چلے
دل مصیبت کے جو بھرنے تھے ہمیں　　ہم محبت میں تمہاری بھر چلے
نے جگر میں آہ نے آنکھوں میں اشک　　کام اپنا عشق میں کیوں کر چلے
ذکر جب خانہ خرابی کا مرے　　بزم میں آیا وہ اپنے گھر چلے
جو کیا سو اے ظفر ہم نے بھرا　　کیا کہیں دنیا میں ہم کیا کر چلے

تجھ کو بہکا دیا کسی نے ہے　　ہائے یہ کیا کیا کسی نے ہے
آشنا آشنا ہیں سب کہتے　　دیکھا بھی آشنا کسی نے ہے
ہم نے دیکھا ہے جو ستم تیرا　　نہیں اب تک سنا کسی نے ہے

کیا مزے ہیں گزرتی تھی لیکن — کردیا بے مزا کسی نے ہے
سبب رنجش ان کا دل کے سوا — نہیں مجھ سے کہا کسی نے ہے
خوبرو یوں سے کیا امید وفا — کبھی کی بھی وفا کسی نے ہے
اے ظفر رو دیا ہے جب میرا — کچھ سنا ماجرا کسی نے ہے

نہ تو کچھ کفر ہے نہ دیں کچھ ہے — ہے اگر کچھ ترا یقیں کچھ ہے
ہے محبت جو ہم نشیں کچھ ہے — اوراس کے سوا نہیں کچھ ہے
دیر وکعبہ میں ڈھونڈتا ہے کیا — دیکھ دل میں کہ بس نہیں کچھ ہے
برق کانپے نہ کیوں کہ تجھ میں ابھی — تاب اے آہ آتشیں کچھ ہے
واہ دنیا عجب ہے رنگارنگ — کہ کہیں کچھ ہے اور کہیں کچھ ہے

اشک جب آیا آستیں تک ہے — تر ہوا پردۂ زمیں تک ہے
آتشِ رشک حسن سے تیرے — داغ بردل مہ جبیں تک ہے
اورچرچے تو سب رہیں گے یونہی — پر یہ مہرو وفا ہمیں تک ہے
ہے اگر روشنی شب غم میں — مشعل آہ آتشیں تک ہے
دل کی شامت ہی لے گئی دل کو — ظفر اس زلف عنبریں تک ہے

حقیقت کچھ نہ کچھ اپنی ادھر اڑتی سی پہنچی ہے — کہیں جاسوس کی ان کو خبر اڑتی سی پہنچی ہے
نہیں پہنچا اسیرانِ قفس تک گل تو گلشن سے — مگر بوئے گل اے بادسحر اڑتی سی پہنچی ہے
جہنم میں کہاں تھی آگ شاید آتشِ دل کی — کوئی چنگاری اے بادسحر اڑتی سی پہنچی ہے
نہ دامن تک ترے اس ناتواں کی گرد پہنچے گی — کہ مدت میں قریب رہ گزر اڑتی سی پہنچی ہے

آئے ہو بالیں پہ گر میری تو صاحب کوئی دم — ٹھہر جاؤ تم نے آخر مہربانی کی تو ہے

اور سب باتیں ہیں اچھی اس پری وش میں مگر — اے ظفر اک اس کو عادت بدزبانی کی تو ہے

شب فرقت میں جی لگتا نہ تھا اپنا کہانی میں — پڑے چپکے سر بستر سنا کرتے تو ہم بھی تھے

جانتا سارا زمانہ ہے ظفر کو عشق میں — وہ ترا دیوانہ مجنوں سے سوا مشہور ہے

مرے احوال پر لطف و کرم کیا ہو نہیں سکتا — جو ہو منظور تم کو مہرباں ہو سکتا سب کچھ ہے

ناصح بے درد کب درد آشنائے عشق ہے — اس سے واقف ہے وہی جو مبتلائے عشق ہے
ہے چمن سے کام کیا ان کو کہ جن کے سینہ میں — رشک صد گلشن ہجوم داغ ہائے عشق ہے

ہو گیا ہے ابتدا ہی سے ظفر یہ تیرا حال
دیکھیے کیا ہو ابھی دور انتہائے عشق ہے

اس نگاہ مست کے مستوں کی مستی اور ہے — اور مے ہے اور ان کی مے پرستی اور ہے
ابر مژگاں سے بندھے جس طرح اشکوں کی جھڑی — اس طرح سے کب گھٹا کوئی برستی اور ہے
جو بلندی چاہتا ہے اپنی مثل گرد باد — چرخ کی گردش دکھاتی اس کو پستی اور ہے

دل میں ہیں سو طرح کے ڈر دیکھیے ہوتا ہے کیا — لے کے واں مجھ کو مری تقدیر پھر پہنچی تو ہے

گر لگے میری ہوائے آہ سردائے سرد مہر — مشعل خورشید بھی اک بار گردوں پر بجھے

کردیا آگاہ اسرار دو عالم سے ظفر — عشق ہی مرشد ہے میرا عشق ہی استاد ہے

گلی سے یار کی جائیں کہاں ہم اے واعظ — کہے ہے تو جسے خلد بریں یہی تو ہے

جو سوزِ عشق ہے دل میں تو داغ جلتا ہے — کہ گھر اسی کا ہے جس کا چراغ جلتا ہے
جلایا دل کو ہے خونابِ حسرت دل نے — شراب گرم ہے اس سے ایاغ جلتا ہے

جائے گا اڑ کر کہاں صیاد یہ مرغ اسیر — ایک تو پر بند ہے اس پر قفس میں بند ہے

کیا کرے گی چھوٹ کر قیدِ قفس سے عندلیب — اب تو ہے وہ بھی شکستہ بال ہم سی ہوگئی

حال مرغانِ چمن کا تو نہیں معلوم پَر — ہیں پڑے سا کھڑے ہوئے گلشن میں بال و پر کئی
ہو بُرا اس سخت جانی کا کہ اس کے ہاتھ سے — رہ گئے پہلو میں میرے ٹوٹ کر خنجر کئی

داغ الفت کو جدا تیرے نہیں کرنے کے ہم — قبر میں بھی اپنی چھاتی سے لگالے جائیں گے[1]

آیا سحاب ساقی تو لا شراب ساقی — تو لا شراب ساقی آیا سحاب ساقی
ساماں شتاب ساقی کر آج میکشی کا — کر آج میکشی کا ساماں شتاب ساقی
ہے پیچ و تاب ساقی زلفوں سے تیری دل کو — زلفوں سے تیری دل کو ہے پیچ و تاب ساقی
کیا مست خواب ساقی آنکھیں ہیں آج تیری — آنکھیں ہیں آج تیری کیا مست خواب ساقی
مت دے گلاب ساقی تو مے کی جائے مجھ کو — تو مے کی جائے مجھ کو مت دے گلاب ساقی
مے آفتاب ساقی ہے ہم خنک دلوں کو — ہے ہم خنک دلوں کو مے آفتاب ساقی
چشم پر آب ساقی تجھ بن ہے ساغر مے — تجھ بن ہے ساغر مے چشم پر آب ساقی
مت کر خراب ساقی تو بزم میکشاں کو — تو بزم میکشاں کو مت کر خراب ساقی

---

[1] ہر داغ محبت کو چھاتی سے لگائے ہیں — جو جان سے پیارا ہے یہ اس کی نشانی ہے (حفیظ جونپوری)

جامِ حباب ساقی دریا میں کس نے الٹا　　　دریا میں کس نے الٹا جامِ شراب ساقی

ہے یہ عذاب ساقی تو ہے ظفر سے بدتر
تو ہے ظفر سے بدتر ہے یہ عذاب ساقی

وہ مہر وش جوآیا گھر میرے بن بلائے　　　یہ تونے آج گردش چرخ بریں نئی کی

بد نام ہے جہاں میں ظفر جن کے واسطے　　　وہ جانتے نہیں کہ ظفر کس کا نام ہے

نہ پوچھو ہم نشینوتم مرے آنسو کہ دریا ہے　　　امنڈ آتا ہے جس دم پھر کوئی روکے سے رکتا ہے
بجز خون دل محزوں بجز چشم دل پُرخوں　　　نہ پاس اپنے ہے گلگوں نہ ساغر ہے نہ صہبا ہے
ظفر میخانۂ عالم میں ہم کو ایک مدت سے　　　نہ مستی کی ہوس نے مے پرستی کی تمنا ہے

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھریاں تھے
شغال اب ہیں جہاں بستے کبھی بستے بشریاں تھے

جہاں چٹیل ہے میداں اورسراسر ایک خارستاں
کبھی یاں قصر و ایواں تھے چمن تھے اور شجریاں تھے

جہاں پھرتے بگولے ہیں اڑاتے خاک صحرا میں
کبھی اڑتی تھی دولت رقص کرتے سیمبریاں تھے

جہاں ہیں سنگ ریزے، تھے یہاں یاقوت کے تودے
جہاں کنکر پڑے ہیں اب کبھی رلتے گہریاں تھے

جہاں سنسان اب جنگل ہے اور ہے شہر خاموشاں
کبھی کیا کیا تھے ہنگامے یہاں اور شورشریاں تھے

جہاں اب خاک پر ہیں نقش پائے آہوئے صحرا
کبھی محو تماشا دیدۂ اہل نظریاں تھے

ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب اب ہیں اور کیا کیا پیشتریاں تھے

درازی وصل کی شب کو ظفر گر ہو تو کیوں کر ہو
کہ اس شب اور چرخ فتنہ پرور تیز چلتا ہے

جی لگے کیوں کر مرا تجھ بن کی نظروں میں مری — گھر ہے ویرانہ سا بھی اور شہر ایک جنگل سا ہے

عشق کے باعث گنے جاتے تھے نادانوں میں ہم — ورنہ گنتے اپنے آگے کس کو دانائی میں تھے

نالہ زنجیر کے غل سے یہ زنداں میں کھلا — آج دیوانوں سے کچھ زنجیر کہتی اور ہے

دل کھول کر نہ کر سکے ہم نالہ وفغاں — دھڑکا یہی رہا کہ وہ نازک دماغ ہے

یہ نہیں معلوم مارا کس کو اس سفاک نے — پر گلی میں اس کی ہنگامہ سا اک برپا تو ہے

گر نہیں غم خوار وحشت میں کوئی میرا نہ ہو — پونچھنے کو میرے آنسو دامن صحرا تو ہے

فصل گل بھی جا چکی لیکن ترے دیوانے کو — وہی سودا ہے سو ہے اور وہ ہی وحشت ہے سو ہے

میں کروں شکوہ جو کچھ ان کو محبت ہے ظفر — جب محبت ہی نہیں ہے تو شکایت کیا ہے

جو نہ دیکھا تھا سو وہ عشق میں تیرے دیکھا　　　دیکھئے اور دکھائی ہمیں قسمت کیا ہے

ہم رہیں ساقی رہے اور دور جانانہ رہے　　　حشر تک بارے یونہی آباد میخانہ رہے
جس کے سر پر ہو وے نہ بیا یار کے کوچے کی خاک　　　خاک اس کو آرزوئے تاج شاہانہ رہے
جس طرح سے شمع پر پروانہ پہ ہوتا ہے فدا　　　اس طرح سے شمع اس کے رخ پر پروانہ رہے
میں وہ مجنوں ہوں کہ صحرا میں زبانِ خار پر　　　تا قیامت اس مری وحشت کا افسانہ رہے

تیغ قاتل کا ادا کب شکر ہوتا ہے ظفر
گو لب ہر زخم پر بسمل کے شکرانہ رہے

سجدہ بتوں کو کوئی نہ کرتا خدا پرست　　　پر ان میں رسم بندہ نوازی ذری سی ہے

کبھی لب پر جو ہنسی اپنے ذری آتی ہے　　　ساتھ ہی آنکھوں میں گریہ میں تری آتی ہے
آئی پھر فصل بہاری، جو بسی پھولوں میں　　　آج گلشن سے نسیم سحری آتی ہے
دیکھ کر سوئے چمن حسرت پرواز ہمیں　　　ہائے کیا کیا دم بے بال و پری آتی ہے
روئے جاناں کا جو آتا ہے ظفر دل میں خیال　　　صاف شیشے سے نظر ہم کو پری آتی ہے

بھرا گو جام مے ساقی نے لیکن ہم کو کیا حاصل　　　کہ اپنا ساغر دل بادہ عشرت سے خالی ہے
گیا یاں سے نکل کیا جانے دیوانہ کہاں تیرا　　　پڑا پھر خانۂ زنجیر اک مدت سے خالی ہے

ترے کوچے میں جاتا کون گر جاتے تو ہم جاتے　　　نہ جاتے ہم بھی پر جاں سے گزر جاتے تو ہم جاتے
نہ تھا ہم سے سوا آئینہ مشتاق ان کی صورت کا　　　گیا کیوں ان کے وہ پیشِ نظر جاتے تو ہم جاتے
نکالا تو نے ہم کو تو گئے ہم تیرے کوچے سے　　　وگرنہ جیتے جی کب جاتے مر جاتے تو ہم جاتے
رفیق اپنے گئے جلدی ہم ان کے ساتھ کیا جاتے　　　اگر اک دو نفس بھی وہ ٹھہر جاتے تو ہم جاتے

گیا روتا ہوا کیا ابر تر گور غریباں پر کبھی گر اس طرف با چشم تر جاتے تو ہم جاتے
بنا تا گر خدا سایہ ہمیں ان کا تو ساتھ ان کے
نہ جاتا کوئی لیکن اے ظفر جاتے تو ہم جاتے

ہم ایسے نہیں ہیں کہ جو آنکھ اپنی جھپا جائے گو برق سی ہر دم تری شمشیر سے چمکے
یہ آگ نہیں وہ کہ بجھا دے جسے پانی عشق اور مرے گریہ کی تاثیر سے چمکے

قطعہ

کتنے ہی بن کے شہر کے اور گاؤں کے نشاں
یوں مٹ گئے زمیں پہ کہ جوں پاؤں کے نشاں
گر نخل خشک کوئی کہیں رہ گیا ظفر
پائے نہ اس کے پاؤں تلے چھاؤں کے نشاں

مخمس بر غزل میر

گل رخو عالم آشنا ہیں ہم   ہم سے کیا پوچھتے ہو کیا ہیں ہم
کہہ چکے تم سے بارہا ہیں ہم   گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم
لیک لگے چلنے کو بلا ہیں ہم

جرم ثابت ہوا ہے کیا ہم پر   نہیں کھلتا یہ ماجرا ہم پر
روز اک ظلم ہے نیا ہم پر   اے بتو اس قدر جفا ہم پر
عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم

گرچہ ہوتی رہی جفا پہ جفا   پھر نہ سرکے وہاں سے ایک ذرا
ہم پہ احسان یہ وفا نے کیا   تیرے کوچے میں تابہ مرگ رہا
کشتۂ منت وفا ہیں ہم

ہوئی ہم کو نصیب جتنی عمر   تھی وہ تھوڑی سی یا بہت سی عمر
ہم نے اس طرح سے بسر کی عمر   آستاں ہی پہ تیرے گزری عمر
اسی دروازے کے گدا ہیں ہم

جیسا تھا شاعری میں اچھا میر   پاتا گر قدر داں بھی ایسا میر
اس طرح اے ظفر نہ کہتا میر   کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر
گویا اک جنس ناروا ہیں ہم

مخمس بر غزل میر

کب میں آوارہ کو بکو نہ گیا　　مضطرب کب ہر ایک سو نہ گیا
عشق خوبان ماہرو نہ گیا　　دل سے شوق رخ نکو نہ گیا
تاکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

نہ رہا وقت دوریٔ جان　　کوئی بھی پاس اپنے مونس جاں
تجھ سا پاؤں گا میں رفیق کہاں　　سب گئے ہوش وصبر وتاب وتواں
لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا

اس کے ملنے کے سب تھے رستے نیک　　اورنزدیک تر وہ ایک سے ایک
دیا غفلت نے مجھ کو دور جو پھینک　　ہر قدم پر تھی اس کی منزل ایک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا

جس جگہ آدمی کا بس نہ چلے　　دست افسوس واں نہ کیوں کہ ملے
تھے مطالب مرے بُرے کہ بھلے　　دل میں کتنے مسودے تھے ولے
ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا

زاہدوں سے ظفر بہم تو رہے　　اوردل پر بھی رنج وغم تو رہے
لیک کہتے یہ دمبدم تو رہے　　سبحہ گرداں ہی میر ہم تو رہے
دست کوتاہ تا سبو نہ گیا

مخمس بر غزل سودا

یہ جانتے سب غنچے بھی ہیں اور گل تر بھی
اور دیتے گواہی ہیں برو برگ و شجر بھی
ہے میری صدا شام بھی یہ اور سحر بھی
گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

مدت میں مرے گھر کی طرف سے جو گزرنا
دو چار گھڑی غیر کے تو پاس ٹھہرنا
اور مجھ سے دو چار آنکھیں بھی اکبار نہ کرنا
کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنا
کافی ہے تسلی کو مری ایک نظر بھی

مانا ترے آنسو دُر خوش آب ہیں سارے
اور ایسے ہیں تابندہ کہ پانی ہوں ستارے
پر یہ تو بتا دے ہمیں انصاف سے بارے
اے ابر قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے
ٹپکا تری آنکھوں سے کوئی لخت جگر بھی

بیٹھے ہوئے ہمدم تو بہت ہیں مجھے گھیرے
پر ایسا نہیں کوئی جو تقدیر کو پھیرے
جانے کا نہیں غم دل نالاں سے یہ میرے
اے نالہ صد افسوس جواں مرنے پہ تیرے
دیکھا نہ کبھی تو نے ذرا روئے اثر بھی

اللہ رے بیہوش تری غفلت سرشار   نے دیں سے ہشیار نہ دنیا سے خبردار
دن رات جو یوں رہتا ہے مست مئے پندار   کس ہستی موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار
کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی

جب سے کہ کوئی باد فنا دست در آغوش   اور شمع صفت میں ہوا اس بزم میں خاموش
دن رات جہاں میں غم و حسرت کا ہے اک جوش   تنہا مرے ماتم میں نہیں شامِ سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبان سحر بھی

ہم کہتے ظفر ہوتی جو سودا سے ملاقات   کیوں کرتا بسر آہ و فغاں میں ہے تو اوقات
تنگ آ کے جو ہمسایہ ترے کہتے ہیں یہ بات   سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

دوہے

کیسا بھالا، کیسی برچھی کیا بچھوا تلوار
اوس دے نیچ نگاہوں کا مینڈے دل پر وار

کھا کر چوٹ برہ کی جی پر کوئی جاوے چوٹ
اس سے پوچھوں لوگاں کس کس دل پر لگدی چوٹ

میں نے اسد ے کارن سہیاں لوگاں گلیاں ساری
اس نے میری ایک نہ مانی کھا کر قسماں ہاری

ناڑی نہ ہاتھ طبیاں دو پوچھوں نہ کوئی وید
روگ لگا مینو وارباً جانے یہ بھید

پیم پیالی بھر بھر پیواں لے کے ہاتھ
میں مدھ ماتی بینڈی کوءنہ جانو بات

ہولی

کیوں موں پر رنگ کی ماری پچکاری
دیکھو کنور جی دوگی میں گاری

بھاگ سکوں میں کیسے موسوں بھاگا نہیں جات
ٹھاڑی اب دیکھوں اوکوں جو سنمکھ آت

سب کو مکھ سے دیت ہے گاری بھری سبھا میں آج
جب میں آپ نہ لج چلوں تو کس کی تو ہے لاج

بہت دنن میں ہاتھ لگے ہو کیسے جانے دوں
آج میں پھگوا توسوں کانٹھا پیٹھ پکڑ کے لوں

شوق رنگ ایسے ڈھیٹھ کہ ان سے کھیلے کون اب ہوری
مکھ موڑے اور ہاتھ مروڑے کر کے وہ برجوری

دیوان سوم

اڑ کے جاؤں ظفر وہاں لیکن ——— بے پر و بال اڑا نہیں جاتا

تیری گلی سے عاشق زار اٹھ کے رہ گیا ——— اٹھا تھا ناتواں سا غبار اٹھ کے رہ گیا
دیتا میں اک جہاں کو بہا سیل اشک سے ——— پر دل میں میرے جوش سا یار اٹھ کے رہ گیا
رکھ ہاتھ سے نہ جام وصراحی اٹھا کے تو ——— ساقی بلا سے ابر بہار اٹھ کے رہ گیا
بھڑکی ہے بےطرح یہ ظفر آج دل کی آگ ——— آگے تو شعلہ سا کئی بار اٹھ کے رہ گیا

ہاتھ اٹھایا سینہ کاوی سے نہ میں نے عشق میں ——— اے جنوں جب تک نہ میرا ٹوٹ ہر ناخن گیا

میں چمن میں بھی رہوں گا دل گرفتہ اے صبا ——— دل نہیں ہے میرا وہ غنچہ کہ جو کھل جائے گا

مثل یہ اے ظفر ہے نکلی ہونٹوں اور چڑھی کوٹھوں ——— نہیں کہنے کی جو بات اس کا کہنا کچھ نہیں اچھا

گر ہوا اس آہ سوزاں کا کوئی شعلہ بلند ——— دیکھ لینا خاک جل کر آسماں ہوجائے گا

سناتے نالۂ پردرد ہم اگر اپنا ——— تو بلبلو ابھی صیاد بلبلا پڑتا
رفیقِ راہِ محبت کدھر گئے یا رب ——— کہیں نظر ہی نہیں اب وہ قافلہ پڑتا

کنارہ کش جو تو اے پرغرور ہم سے ہوا ——— جتائی ہم نے محبت قصور ہم سے ہوا[1]
ہزاروں دل میں تھے مطلب ہمارے پر منھ سے ——— بیاں نہ ایک بھی ان کے حضور ہم سے ہوا[2]
کیا نشے نے محبت کے اس قدر مسرور ——— تمام عمر نہ زائل سرور ہم سے ہوا

---

[1] حسن بے پروا کو خود بین وخود آرا کردیا ——— کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کردیا (حسرت)
[2] دل میں کیا کیا مسودے تھے مگر ——— ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا (میر)

بڑا رفیق تھا لیکن تری جدائی میں　　جدا ہمارا دل ناصبور ہم سے ہوا
ہم اس سے آپ رہے دور اپنی غفلت میں　　وہ اے ظفر نہ کسی وقت دور ہم سے ہوا

کہو گے حال دل اپنا ظفر کیا مہ جبینوں سے　　کہ ان کا تو دماغ اے مہرباں پایا نہیں جاتا

نہیں پرواز کی صیاد بال و پر میں جب طاقت　　قفس سے ہم اسیروں کو رہائی گر ہوئی تو کیا

نہ چھوڑی اس بت کافر کی ہرگز دوستی میں نے　　ظفر دشمن مری ساری خدائی گر ہوئی تو کیا

بن تیرے عجب حال مری جان ہے مرا　　بیٹھا ہوں کہیں اور کہیں دھیان ہے میرا
حالِ دلِ غمگیں نہ کہا میں نے کسی سے　　اے حضرت غم تم پہ یہ احسان ہے میرا

دل ہی فقط کیا تو نے دکھا کر اپنی ادا وآن لیا
بلکہ دل کے ساتھ اے کافر دین لیا ایمان لیا
دل نہیں مانتا میرا ناصح یہ مانے تو کام چلے
تو نے تو جو مجھ سے کہا سب سچ ہے وہ میں نے مان لیا
جو کہ ہوا شمشیر نگہ کا تیری قاتل منت کش
تیغ اجل کا اپنے سر پر کب اس نے احسان لیا
کوئی بنایا ایسا بشر ہے جیسا ظفر وہ رشک پری
سارا پرستاں ڈھونڈھا ہم نے سارے جہاں کو چھان لیا

دیکھنا اک دن جلا کر خاک کر دے گا مجھے　　کام ہی میرے کبھی سوزِ دروں آجائے گا

مل گیا دریا میں جب قطرہ تو دریا ہوگیا　　جزو کل میں ہوا گم جزو سے وہ کل بنا

تری اس بے وفائی پر فدا ہوتی ہے جان اپنی　　خدا جانے اگر تجھ میں وفا ہوتی تو کیا ہوتا

سہے ظلم ان ستم گاروں کے کوئی کس توقع پر　　کہ یاں ظلم و ستم بھی تو سہے سے کچھ نہیں ہوتا

اڑ کے جا سکتے چمن تک نہیں مرغانِ قفس　　اے صبا ان کا اڑا کر کوئی پر تو لے جا

ابھی صیاد کی لگی ہے آنکھ　　نہ کرو شور بلبلو چپ چپ

ظفر نہیں ہے اگر باغباں کا کچھ کھٹکا　　تو آج کیوں ہوئے مرغانِ بوستاں ہیں چپ

رات کو جاتے تھے تم غیروں کے گھر سچ ہے کہ جھوٹ
چھپ گئے تھے آپ ہم کو دیکھ کر سچ ہے کہ جھوٹ

ان کے آنے کی سنی ہے ہم نے اڑتی سی خبر
اے صبا تو سچ بتا دے یہ خبر سچ ہے کہ جھوٹ

اپنا جلوہ تم دکھا دو سب کو تا معلوم ہو
ہم جو کہتے ہیں تمھیں رشک قمر سچ ہے کہ جھوٹ

کھینچتے ہیں آج اے دل ان کو ہم اپنی طرف
دیکھتے ہیں جذب الفت میں اثر سچ ہے کہ جھوٹ

خط میں تو ہے سر بسر مضمون الطاف و کرم
پر خدا جانے لکھا اے نامہ بر سچ ہے کہ جھوٹ

جب تلک جل بھن کے سرتا پا نہ میں ہو جاؤں خاک
کیا کوئی جانے مرا سوز جگر سچ ہے کہ جھوٹ
عشق میں جو حال ہے میرا نہیں اس میں خلاف
قصۂ مجنوں خدا جانے ظفر سچ ہے کہ جھوٹ

ہوا ہے عہد میں ظالم ترے جفا کا رواج
کہاں ہے رسم محبت کہاں وفا کا رواج
جہاں میں پہلے کبھی تھے خوش ادا پر ایسا نہ تھا
جو تیرے عہد میں ہے غمزہ وادا کا رواج

یا کبھی رہتے تھے گلشن ہی میں یا مدت سے
ہم قفس میں ہیں صبا گل کی خبر کے محتاج

کھلے ہے دام کے رشتے کا پیچ کب صیاد
پڑا ہوا ہے یہ تقدیر عندلیب کا پیچ

میرا نالہ دے گا سارا تیرا ٹیڑھا پن نکال
دیکھ چل اے آسمان کینہ در سیدھی طرح

جلایا آہ کے شعلے نے خیمۂ افلاک
بڑھا ہے دیکھو تو کیا سوزش جگر کا فساد

برسر مہر ہے ستم ایجاد
دوستو مجھ کو دو مبارک باد
دشت میں قیس کوہ میں فرہاد
دونوں کہتے ہیں مجھ کو یا استاد
خاطر گل ہے نازک اے بلبل
نہ کر اتنی چمن میں تو فریاد
برق خنداں ہے ابر گریاں ہے
کوئی یاں شاد ہے کوئی ناشاد
ہم ہوئے خاک عشق میں تیرے
ہوگئی بلکہ خاک بھی برباد
دے دیا اب تو دل ظفر ہم نے
اس ستم گر کو ہرچہ بادا باد

چمن کو یاد کر کے ہم قفس میں اس قدر پھڑکے
کہ بازو ٹوٹ کر دونوں ہوئے لوہو میں غچ بچ پر

کوچۂ جاناں کے جانے کی نکالی ہے یہ راہ
خاک ہو کر آ پڑے ہیں ہم صبا کی راہ پر

کیا ذکر کچھ کلام میں واعظ کے ہو مزا
محفل میں وصف بادہ و ساغر کہے بغیر ۱؎

ظلم بد جوہر سے کیا نقصان شریفوں کو ملے
کب گھٹائے قدر زر لوہا کمینہ لوٹ کر

جو دل میں رکھے اور کرے منہ سے بیاں اور
ہر بات پر اس کی ہو مجھے کیوں نہ گماں اور

اک بار کیے نذر دل و جاں ترے دونوں
اب کیا تجھے دیں ہم کو نہ دل اور نہ جاں اور

دے جام پہ گر جام پیا تجھے مجھے ساقی
میں بس نہ کہوں اس سے کہے جاؤں کہ ہاں اور

جل جائے گی اے برق نہ ہو دیکھ مقابل
ہے سوختہ جانوں کا دمِ شعلہ فشاں اور

کچھ چشم تر اور سوز جگر پر نہیں موقوف
افشائے محبت کے بہت سے ہیں نشاں اور

کس طرح غمِ یار کو میں دل سے نکالوں
جائے یہ کہاں اس کا ٹھکانہ ہے کہاں اور

کیا ہووے گا اک چاک کو سینے کے سیئے سے
دل میں تو ہزاروں ہیں ابھی زخم نہاں اور

یہ شوق شہادت کی ہے تاثیر کہ قاتل
ہوتی ہے مرے خوں سے تری تیغ رواں اور

تو گھر کو سدھار اپنے خدا کے لیے ناصح
ہوتا ہے تری باتوں سے مجھ کو خفقاں اور

مینھ خوب برستا ہے جو ہوتی ہے ہوا بند
بہتے ہیں ظفر اشک دمِ ضبطِ فغاں اور

یوں ہوا دل میں مرے یار کا پیکان عزیز
جس طرح آیا ہو گھر میں کوئی مہمان عزیز

بخدا اے بت بدکیش کہ ہم کو تجھ سے
نہ تو ہے دین عزیز اور نہ ایمان عزیز

۱؎ اتنی تو ہو بیان میں واعظ شگفتگی
ہم رند سن کے قلقل مینا کہیں جسے (ریاض)

شمع رو جس کے لگے دل کو ترے وصل کی لو　　مثل پروانہ اسے اپنی نہیں جان عزیز
ناصحا ہاتھ اٹھا فکر رفو سے کہ ہمیں　　دشت وحشت سے نہیں اپنا گریبان عزیز
اے ظفر ہے وہ ستم گار نہایت سفاک　　دل نہ دے اپنا اسے دیکھ کہا مان عزیز

صیاد ظلم پیشہ نے کچھ آج بے طرح　　کی ہے چھری برائے اسیران دام تیز

کر تو خوشی سے حرف و حکایات چند روز　　اے یار پھر کہاں کہ ہے یہ بات چند روز
بیٹھا ہے اعتکاف میں کیا زاہدوں کی طرح　　تو اٹھ کے کر لے سیر خرابات چند روز
ہو جلد ہوشیار کہ جاتے ہیں ہاتھ سے　　غافل نشاط و عیش کے ہیہات چند روز
کچھ لطف زندگی کا اگر ہے اسی میں ہے　　ہے یہ جو دوستوں کی ملاقات چند روز
فرصت بہت ہی کم ہے غنیمت سمجھ ظفر　　ہنس بول کر بسر ہو جو اوقات چند روز

کہتے ہیں آپ کو وہ ہنر ور زمانے میں　　جن پر کبھی پڑا بھی نہیں ہے ہنر کا عکس

ڈرتا ہوں جل نہ جائے کہیں خیمۂ فلک　　اے آہ سوز ناک نہ ہو تو بلند بس

ذرا بھی پائی نہ گرمی اگلوں کے دل میں صبا　　یہی تھی نالۂ پرسوز عندلیب کے بس

بعد آزادی بھی دے ہے رنج تاثیر قفس　　ہوش اڑ جاتے ہیں گر دیکھوں ہوں تصویر قفس
ہم چمن میں کر رہے ہیں آشیاں اپنا درست　　کرتا ہے صیاد فکر دام و تدبیر قفس
مجھ کو صیاد جفا پیشہ نے ڈالا دام میں　　نے قصور دام ہے اس میں نہ تقصیر قفس

سخت جانوں پہ نہ کر وار کہ جی ڈرتا ہے　　کہیں آ جائے نہ قاتل تری تلوار میں نقص

ہم اس چمن میں غنچۂ تصویر ہیں ہمیں مطلب نسیم سے ہے نہ تجھ سے صبا غرض

تا باغ ہم نہ پہنچے قفس ہی میں مر گئے کہہ کر کہ ہائے ہائے چمن ہائے ہائے باغ

جائے صیاد دام سے تیرے اڑ کے مرغ شکستہ بال دریغ

ہم ہوئے جب سے کہ اس ماہ جبیں سے واقف پھر جہاں میں نہ ہوئے اور حسیں سے واقف
عین ایمان سمجھتے ہیں ہم ان کا دیدار نہ تو ہیں کفر سے آگاہ نہ دیں سے واقف
کوچہ اس حور شمائل کا سمجھتے ہیں بہشت ہم نہیں ہیں چمن خلد بریں سے واقف

جہاں میں اور تو ڈرتے ہیں غیر سے لیکن ظفر رہے ہے مجھے اپنے آشنا کا خوف

مزا ہے کچھ تو مصیبت میں عشق کی ناصح اٹھاتے جان پہ جو اس قدر ہیں ہم تکلیف

ڈر ہے نہ کہیں خیمۂ افلاک جلا دے ہے نالۂ سوزاں میں ہمارے اثر عشق

قفس سے چھٹ کے مرغ ناتواں کیا جائے گلشن میں
کہ جھڑ پڑتے ہیں جاتے جاتے سب پر ٹوٹ کرواں تک

ہزار افسوس ہے بلبل چمن میں رہا تیرا نہیں اب ایک پر تک

جیسے ہے عشق کی تیرے دل بیتاب میں آگ یوں کوئی بھر تو سکے ساغر سیماب میں آگ
لخت دل آنسوؤں کی رو میں چلے آتے ہیں کیا تماشا ہے کہ یاں بہتی ہے سیلاب میں آگ

سوزشِ غم سے ہے میرے جگر و دل کا یہ حال — جیسے لگ جائے کسی شخص کے اسباب میں آگ
طرزِ نالہ کی ظفر سیکھے جو ہم سے بلبل — تو لگا دے چمن لالۂ سیراب میں آگ

تیرے دیوانے کی آنکھوں سے جو ٹپکا اشک گرم — کیا تعجب گر لگا دے دامنِ صحرا میں آگ
بھر دے انگاروں سے دم میں لالہ و گل کا چمن — پر کہاں اتنی نوائے بلبلِ شیدا میں آگ
کوہ تک بہ جائے مثل موم سب ہو کر گداز — میرے دل کی سی اگر ہو سینۂ خارا میں آگ

آگے تو ہم سے اس قدر تھا نہ کبھو الگ الگ — اب ہوئی ایسی کیا خطا رہتا ہے تو الگ الگ
چشم سے ہر مژہ پہ یوں جلوہ نما ہیں اشک و خواں — جیسے چراغ رکھ دیئے ہوں لب جو الگ الگ
دشت جنوں ابھی مرا پہنچا نہیں ہے جب تلک — ہو گئے خود بخود جدا تار رفو الگ الگ
آج ہے کیا ساقیا بزم میں ہیں دھرے ہوئے — شیشۂ و خم جدا جدا جام و سبو الگ الگ
گل جو چمن چمن میں ہیں دیکھ ظفر ہے کیا بہار — سب کا ہے رنگ الگ الگ سب کی ہے بو الگ الگ

میری آہِ آتشیں سے کیا عجب جائے شفق — پھیل جائے دامن چرخ ستم پرور میں آگ

جو بوئے گل رفیق نسیم چمن ہیں ہم — اے ہم دمو وطن میں غریب الوطن ہیں ہم
یارو نہ روکو عشق میں رونے سے تم ہمیں — اس سے بجھاتے دل کی کچھ اپنے جلن ہیں ہم
ہیں گرچہ مثل شمع سراپا زباں تو کیا — کہہ سکتے پر زباں سے نہیں اک سخن ہیں ہم
دیوانگی کا شور ہے مجنوں کی اے ظفر — دکھلاتے جب تلک نہیں دیوانہ پن ہیں ہم

خدا جانے کہ سینے میں مرے کیا رنگ ہے دل کا — نظر آتی ہے کچھ آمیزش خوں آج آنسو میں

پہنچیں گے کیوں کر چمن تک ہم قفس سے چھوٹ کر — طاقت پرواز اپنے بال و پر میں کچھ نہیں

بل بے نفرت کہ ہمیں دیکھ کے خوبانِ فرنگ	جلد جلد اور بھی بگھی کو سوا ہانکتے ہیں

یہ نہیں معلوم وہ تقدیر میں ہے یا نہیں	ایک وصل یار کی ہم آرزو رکھتے تو ہیں

قمار عشق میں رہتی ہے بازی ان کے ہاتھ	وہ جان ہار کہ جان اپنی اس میں ہارتے ہیں

ایک بدگو ہو تو میں اس کے سخن کو پکڑوں	واں بھی ایسے ہیں کس کس کے دہن کو پکڑوں
ہمصفیرو کہو کیا کیجیے کہ آیا صیاد	لے کے پھر دام کہ مرغان چمن کو پکڑوں

مہکے ہوئے اٹھتے ہیں خوشبو میں سحر جس شب	ہم لیکے بغل میں اس گلفام کو سوتے ہیں

اللہ ری شرم آئے جو وہ شب کو خواب میں	پنہاں رکھا حجاب سے منہ کو نقاب میں
خوشبو ہے جو پسینے میں اے گلبدن ترے	نے وہ گلاب میں ہے نہ عطر گلاب میں
میرے دل شکستہ میں آکر وہ کیا رہے	رہتا ہے کون ایسے مکان خراب میں
یوں آنسوؤں کے ساتھ پیا ہم نے خون دل	جیسے ملا کے پیتے ہیں پانی شراب میں

قفس میں ہے کیا فائدہ شور و غل سے	اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

پڑا جو خانۂ زنداں میں غل خدا جانے	کہ میرے پاؤں کی زنجیر ہل گئی تھی کیوں

نے کبھی ہوں شاد شادی میں نہ غمگیں غم میں ہوں	میرا عالم اور ہے میں اور ہی عالم میں ہوں
کیوں پھروں آوارہ اس کو ڈھونڈتا مثل صبا	میرا ہمدم مجھ میں ہے اور آپ میں ہمدم میں ہوں
کیا کرے گا اشک باری ابر میرے سامنے	میری نادانی ہے گر میں فکر بیش و کم میں ہوں

کاسۂ چشمِ تصور چھوڑ کر اپنا کبھی　　اے ظفر محوِ تماشا میں نہ جامِ جم میں ہوں

نہیں ہے طائرِ تصویر آسا دامِ حیرت میں　　کسی صورت رہائی ہم گرفتاروں کی قسمت میں

دل لگانے کی باتیں اور ہی ہیں　　جی دکھانے کی باتیں اور ہی ہیں
دل کی باتوں کا کیا ٹھکانا ہے　　کہ ٹھکانے کی باتیں اور ہی ہیں
کیا کہی بات ہم نے تم سے خلاف　　روٹھ جانے کی باتیں اور ہی ہیں
تو اگر چاہے آئے یاں سو بار　　پر بہانے کی باتیں اور ہی ہیں
کیا بجھاؤ گے میری سوزشِ دل　　کہ بجھانے کی باتیں اور ہی ہیں
آزماتے ہیں وہ وفا میں کسے　　آزمانے کی باتیں اور ہی ہیں
زہر کھاتا ہے بات بات پہ کون　　زہر کھانے کی باتیں اور ہی ہیں
ہم کہاں اور کہاں قفسِ صیاد　　آب ودانے کی باتیں اور ہی ہیں
شمع کیا جانے طرزِ دل سوزی　　دل جلانے کی باتیں اور ہی ہیں
ظفر اگلا زمانہ تھا کچھ اور　　اس زمانے کی باتیں اور ہی ہیں

گئی آہ جگر کہیں کی کہیں　　جا ہی پہنچی خبر کہیں کی کہیں
میں کہوں بات تو وہ لے جائیں　　جی میں کچھ سوچ کر کہیں کی کہیں
ہوگا پردے سے کیا کہ پردہ نشیں　　میری پہنچی نظر کہیں کی کہیں
لے گئی بوئے زلف اڑا کے تری　　ہائے بادِ سحر کہیں کی کہیں
میری اور میری چاہ کی اک دھوم　　پہنچی اے فتنہ گر کہیں کی کہیں
سمجھے اپنا گلہ ہے وہ ان کو　　میں نے باتیں اگر کہیں کی کہیں
میری وحشت لیے پھرے ہے مجھے　　ان دنوں اے ظفر کہیں کی کہیں

آہ اس صورت کدے میں دیکھتے ہی دیکھتے صورتیں کیا کیا نظر سے اپنی پنہاں ہو گئیں

وہ جو رونے کا ہمارے پوچھتے ہیں ماجرا اور بھی ہو جائے ہے گریہ کی شدت کیا کہیں

غم ہے کیا ساقی کہ ہستی کا نہیں کچھ اعتبار تو دیئے جا بھر کے ساغر کچھ نہیں تو کچھ نہیں
تم جو کہتے ہو ظفر کو کچھ نہیں یہ آدمی خیر بہتر بندہ پرور کچھ نہیں تو کچھ نہیں

اے ظفر جب کہ ہوئی فرصت گلگشت ہمیں نہ رہا گل کا سر دامن گلزار نشاں

گر ناز سے وہ صحن میں رکھے چمن کے پاؤں چومے زمیں پہ گر کے گل اس گلبدن کے پاؤں
اے عشق کیا صلاح ہے تیری بتا مجھے لوں شیخ کے قدم کہ پڑوں برہمن کے پاؤں
اتنا نہ آہ و نالہ سے اپنے ہلا اسے اے دل نہیں ہیں گنبد چرخ کہن کے پاؤں
کیوں کر نکل سکے دل وحشی کہ پھنس گئے پھندے میں اس کی زلف شکن در شکن کے پاؤں
دشت جنوں میں اتنی بھی وسعت نہیں ظفر
پھیلیں جو اک ذرا مرے دیوانہ پن کے پاؤں

وہ دیکھے سوز محبت سے دل کے داغ کی لو نہ دیکھی جس نے ہو بھڑکے ہوئے چراغ کی لو

جس سے آرام ہو دل دیجے کسی ایسے کو نہ کہ دل لے کے دکھاتا رہے جی ایسے کو
شکوہ بے جا ہے اگر دل کو نہ چھوڑے غم عشق دل میں بھی ہم نے جگہ آپ ہی دی ایسے کو
دل ہے اس دلبر نازک کا الٰہی کیوں سخت زیب دیتی نہیں یہ سنگدلی ایسے کو
اس زمانے میں نہ آتے ہوں جسے مکر و فریب سچ تو یہ ہے کہ ظفر کہیے ولی ایسے کو

قسم کھائی ہے یارو اس نے میرے گھر میں آنے کی　　جو تم سے آسکے تو کر کے کچھ تدبیر لے آؤ

دوست اچھے ہو تو پورے دوستی کے ہو رہو　　یا کسی کو کر رکھو تم یا کسی کے ہو رہو [1]
اس چمن میں کیا کرو گے میکشو ہنس بول کر　　غنچہ ساں خاموش خونِ دل کو پی کے ہو رہو
ناصحو دکھلادے وہ جلوہ تو میری طرح سے　　تم بھی دیوانے سے اس رشکِ پری کے ہو رہو
جاتے ہو یارو مرے ہو کر طرفدار اس کے پاس　　پر کہیں ایسا نہ ہو تم بھی اسی کے ہو رہو
کرتے ہو برباد اپنی خاکساری کیوں ظفر　　اس کی خاکِ درغبار اس کی گلی کے ہو رہو

دل ہے وہی پسند جو تجھ پر فدا رہے　　جاں ہے وہی عزیز جو تجھ پر نثار ہو
ہوں خاک راہ اس کا پر ایسا نہ ہو ظفر　　میرا غبار خاطر نازک پہ بار ہو

میں نے کہا کہو تو مسیحا کہوں تمھیں　　کہنے لگے کہ کہنا ابھی پہلے مر تو لو

حضرت دل بیٹھے ہو گر کام سے بیٹھے رہو　　میرے گھٹنے سے لگے آرام سے بیٹھے رہو
جا کے دیر و کعبہ میں کیا لو گے تم اے غافلو　　ہاتھ اٹھاؤ کفر اور اسلام سے بیٹھے رہو
چرخ تک چکر میں سب ہیں کیوں کہ یارو زیر چرخ　　بچ کے تم اس گردش ایام سے بیٹھے رہو
اے اسیرو اب نہ پر میں طاقت پرواز ہے　　کیا کرو گے تم نکل کے دام سے بیٹھے رہو
وہ دکھائے گا کبھی تو جلوہ اپنا اے ظفر　　تم لگائے آنکھیں اپنی بام پر بیٹھے رہو

دم بھی لینے کی نہیں ضعف سے طاقت اس کو　　تہمت نالہ نہ تم اپنے ظفر پر رکھو

---

[1] کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے　　دو روزہ عمر کو انساں نہ رایگاں کاٹے　(آتش)

دیکھو کیا میرے دیدۂ خونبار   آج ہیں گلفشاں ادھر آؤ

قطعہ

غافلو ہو کہ نہ ہوتم کو سفر میں کچھ سود
ساعت نیک منجم سے مگر پوچھتے ہو
لیک جب جاتے ہو دنیا سے سوئے ملک عدم
نہ کوئی دن نہ کوئی وقت سفر پوچھتے ہو

اٹھاؤ ہاتھ بس اب شیوۂ جفا سے ڈرو   کہ ظلم خوب نہیں اے بتو خدا سے ڈرو
نہ چھیڑو زلف کو اس کج ادا کی حضرت دل   بری بلا ہے یہ کافر تم اس بلا سے ڈرو
مبادا پھونک دے کچھ کان میں گلوں کے یہ   چمن میں دیکھو تم اے بلبلو صبا سے ڈرو
جو دل میں آئے سو کہہ دو تمھیں ہے ڈر کس کا   کہ آشنا سے نہ تم غیر آشنا سے ڈرو
نگاہ یار سے تم ہو نڈر نہ بو الہوسو......   جو ڈر ہے جاں کا تو اس ناوک قضا سے ڈرو
جو باغباں کا ہے کھٹکا تمھیں طیورِ چمن   تو کھڑکے ایک بھی پتا اگر ہوا سے ڈرو
وہ لے ہی جائیں گے اک پل میں چھین کر دل کو   ظفر ڈرو نگہ شوخ دل ربا سے ڈرو

تم چلے ہو کہاں کھڑے تو رہو   جانا اے مہرباں کھڑے تو رہو
جاؤ تنہا نہ تم، تمہارے ساتھ   جائے گی میری جاں کھڑے تو رہو
ہے پڑی دل جلوں کی آہ جہاں   تاب کیا تم وہاں کھڑے تو رہو
قد پہ نازاں ہے اپنے سرو چمن   اک ذرا تم بھی ہاں کھڑے تو رہو
ہم رہو تھک کے ہیں رہے جاتے   ہم پس کارواں کھڑے تو رہو
وہ بلائیں گے تم کو گھر میں ظفر   تم سر آستاں کھڑے تو رہو

دکھائے محتسب شہر طمطراق ہزار   کوئی جھپکتی ہے رند قدح بدست کی آنکھ

کھٹکے سے باغباں کے چمن میں نہیں رہی　　بلبل کے بیٹھنے کے لیے شاخ پر جگہ

چھوڑ کر اس بت کافر کے ظفر در کا طواف　　آپ کو کعبہ کا آہنگ ہے اللہ اللہ

نہ ڈال بارِ غم اے چرخ ان نحیفوں پر　　کہ جن سے اٹھ نہ سکے اپنے بھی بدن کا بوجھ

غمِ فرقت سے ہے یہ حال کہ میرا غم خوار　　منھ کو چپکا مرے بادیدۂ تر تکتا ہے
کوئی ٹھہراتا نہیں وصل کی صورت ان سے　　صورت ایک ایک کی ناچار ظفر تکتا ہے

مئے عیش و طرب کا ایک قطرہ بھی نہیں ساقی　　ظفر یہ آسماں ہیں یونہی دکھلانے کے پیمانے[1]

مہرباں صیاد ہو کر ہو گیا نامہرباں　　دام سے ہم کو رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

جگائے بخت خوابیدہ کو گر میرے تو میں جانوں　　بلا سے نالۂ شب گیر سوتوں کو جگاتا ہے

تھی ترے دید کی ہر دم مجھے حسرت دونی　　تجھے دیکھا تو ہوئی اور محبت دونی
میرے داغ دل سوزاں کا پڑا جو پر تو　　ہوگئی تابش خورشید قیامت دونی
تیری زلفوں کو ہوا دیکھ کے سودا دونا　　تیری آنکھوں کو ہوئی دیکھ کے وحشت دونی
میرے گریہ نے نہ دھویا دل جاناں سے غبار　　بلکہ اس سے تو ہوئی اور کدورت دونی
میں جو رسوائے جہاں ہوں تو بلا سے تیری　　تجھ کو کیا تیری تو ہو جائے گی شہرت دونی
روبرو یار کے رخسار مصفا کے ظفر　　اور آئینہ حیراں کو ہے حیرت دونی

---

[1] مئے عشرت کی خواہش ساقئ گردوں سے کیا کیجے　　لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی (غالب)

ہاتھ سے ساقی کے لینا جام کچھ مشکل نہیں اپنی قسمت چاہیے اور اپنا لہنا چاہیے

جن کے سبب رہے ہے رنج وملال مجھ کو وہ مجھ سے پوچھتے ہیں رنج وملال کیا ہے

دل کی اپنے مجھے ہے اس لیے خاطر منظور کہ ترا شیفتہ یہ ہے ترا شیدا یہ ہے

سن لو جو ہے خانۂ زنداں میں دیوانوں کا حال کرکے برپا غل سدا زنجیر کچھ کہتی تو ہے

پھر درستی خاطر پیاں شکن میں کچھ تو ہے پایا جاتا لطف اب اس کے سخن میں کچھ تو ہے
جاتے دیوار چمن تک ڈرتے ہیں مرغ چمن ان دنوں اے باغباں کھٹکا چمن میں کچھ تو ہے
اس پری کو دیکھ کر ہوتے ہیں دیوانے جو ہم ناصحا آتا مزا دیوانہ پن میں کچھ تو ہے
تا نہ روکیں یار رونے سے مجھے کہتا ہوں میں فرق گریہ سے مرے دل کی جلن میں کچھ تو ہے

شانہ ہے یا ہے دل صد چاک میرا اے ظفر
الجھا اس کافر کی زلف پرشکن میں کچھ تو ہے

اک حرف محبت نے یہ طوفان اٹھایا ہم سارے کتب خانے کو دریا میں ڈبو آئے

الٰہی کس کی یہ آواز میرے کان پڑی کہ جس سے پھر تن بے جاں میں میرے جان پڑی
وہ بات کل کی جو یاد آگئی مجھے تیری تو آج جی کو نہ کل میرے ایک آن پڑی
لگایا جس نے دل اس ماہ وش سے اس پر روز مصیبت ایک نئی زیر آسمان پڑی
لگا سکے گا کوئی کیا تمہارے حسن کو عیب کہیں بھی چاند پہ ہے خاک مہربان پڑی

کھڑے تھے اور بھی سر بازیوں کو پر ان کی
ظفر مجھی پہ نظر وقت امتحان پڑی

کہیں ٹوٹے ہوئے شیشے پڑے ہیں اور کہیں ساغر
خرابی میکدہ میں آج اے پیر مغاں کیا ہے

بلا سے جام فلک اشتباہ سے گر جائے — مگر نہ کوئی کسی کی نگاہ سے گر جائے
اگر ہو کوہ بھی ہو جائے جل کے خاکستر — جو برق سوختہ جانوں کی آہ سے گر جائے
چڑھائے مہر اسے سر پر مثال تار شعاع — جو تاج زر تری زریں کلاہ سے گر جائے

ہم پھڑک لیں اور بھی صیاد تیرے دام میں — کوئی دم طاقت ہمارے بال پر میں اور ہے

بلا سے شمع جلی رات بھر جو سر کے بل — سحر کو منزل مقصود پر تو جا پہنچی

ستم تیرے اٹھائے پر نہ اٹھے اس گلی سے ہم — زمیں ہم نے بھی پکڑی تو نہ پھر اے آسماں چھوڑی

دل اس کو دیا سخت اگر سنگ بلا سے — پر آہ کو یارب مرے کیوں بے اثری دی

نہ سمجھو رنگ شفق اس کو لگ رہی ہے آگ — کہ ہے فلک پہ مری آہ شعلہ ور پہنچی

غم فرقت میں قائل ہوں تو میں اس کی رفاقت کا — کہ اک دم چھوڑ کر مجھ کو نہیں تنہائی جاتی ہے

سن کے احوال مرا گرچہ ہوں پتھر پانی — سنگدل پر نہ تری آنکھوں سے آنسو نکلے
پا سکے رمز و کنائے کوئی کیا اس کے ظفر — جس کی اک بات میں سو طرح کا پہلو نکلے

ہائے صیاد جا کے گلشن تک — کیوں کہ مرغ شکستہ پر ہو آئے

کہیں ایسا نہ ہو کھل جائے دل کا راز محفل میں
ہماری آنکھ پھر اس رونق محفل سے ملتی ہے

دو عالم کو ہم مے پرستی میں بھولے
مگر ایک ساغر نہ مستی میں بھولے
بگولے کے مانند پھرتے رہے ہم
خیالِ بلندی و پستی میں بھولے
جو ہو عشق رہبر تو پھر کوئی رستہ
نہ جنگل میں بھولے نہ بستی میں بھولے
اسے بت کدہ کعبہ ہے، کفر ایماں
خدا کو نہ جو بت پرستی میں بھولے
نہیں یاد کیا جانے کیا تھا عدم میں
کہ بالکل وہ ہم آ کے ہستی میں بھولے
پھر میکدے سے چلے خانقہ میں
ظفر راہ میکش جو مستی میں بھولے

اب تو دیتے ہیں دل انہیں اپنا
ہوں گے جو رنج و غم سمجھ لیں گے

کہتے ہیں بُرا سب ہمیں محفل میں تمہاری
کچھ کہتے نہیں سنتے ہو تم کان سے بیٹھے

نہ کیوں کہ شوق کی گرمی سے دل کا داغ جلے
وہ کہہ گئے ہیں کہ آئیں گے ہم چراغ جلے
مریِ طرح سے جو آتش نفس ہوا ے بلبل
تو ایک نالہ سے تیرے تمام باغ جلے
ظفر ہے رشک سعیدوں پہ بدخصالوں کو
ہما کو دیکھ کے کیوں کر نہ دل میں زاغ جلے

اگر باندھیں مرغان پربستہ ہمت
تو لیں کھول آپس میں مل جل کے پھندے

مرے دل کی حقیقت چشم نم کچھ اور کہتی ہے
ولیکن آہ سوزاں دمبدم کچھ اور کہتی ہے
اٹھا دیتا ہے جو پردہ ذرا تو روئے زیبا سے
ابھی خلق خدا تجھ کو صنم کچھ اور کہتی ہے
اثر اے عندلیب زار کیا ہو تیرے نالوں کا
کہ گوش گل میں باد صبح دم کچھ اور کہتی ہے
نہیں کھلتا مرا حال پریشاں زلف سے تیری
کہ وہ کافر ترے سر کی قسم کچھ اور کہتی ہے

بچے گی جان کیوں کر دیکھیے قاتل کے ہاتھوں سے
کہ اس کی آج شمشیر ستم کچھ اور کہتی ہے
بتائے عشق میں ہے عقل کوئی بات کب ڈھب کی
ظفر جب پوچھتے ہیں اس سے ہم کچھ اور کہتی ہے

نسیم صبح جو سوئے چمن گئی ہوگی
تو بس کے پھولوں میں دلہن سی بن گئی ہوگی
شکستِ شیشۂ دل کیا کہوں کہ اک آواز
ترے بھی کان میں اے دل شکن گئی ہوگی
یقین جانو کہ لگ اٹھی ہوگی آگ اُدھر
جدھر کو آہ مری شعلہ زن گئی ہوگی
شب اس کی بزم میں کیوں شمع ہوگئی خاموش
مگر مری خبر سوختن گئی ہوگی
جہاں میں جس کو ہوئی ہوگی تیری خواہش وصل
وہ اس کے ساتھ ہی زیر کفن گئی ہوگی
ظفر جو تیری ہوئی ہوگی یار سے ان بن
خدا ہی جانے کہ کیا جی پہ بن گئی ہوگی

کچھ تو کی تاثیر الفت نے کہ وہ اے ہمنشیں
گریۂ حسرت پہ اپنے مبتلا کے ہنس پڑے

کچھ آپ سے پروانہ نہیں آگ میں جلتا
لگ جاتی ہے جب شمع کی لو بن نہیں آتی

بے پروبالی جانے دے گی کیونکہ اڑا کر گلشن تک
تو نے مجھے آزاد قفس سے اے صیاد کیا تو ہے

ابھی آئی نہیں بہار کہ یاں
دل میں وحشت کے ولولے آئے

جن پہ عنقا کی طرح سے گوشہ گیری ختم ہے
ان پہ بے دام و قفس گویا اسیری ختم ہے
کی ہے جن نے یار کے در کی گدائی اختیار
بادشاہی ہے تمام اس پر اسیری ختم ہے
جو تمہارے دل میں ہے وہ سب ہمیں معلوم ہے
ہم پہ فیض عشق سے روشن ضمیری ختم ہے

کہتے ہیں اہل سخن تیرا سخن سن کر ظفر
بس یہاں طرز نظیری وظہوری ختم ہے

نہ خوشی وصل کی ہے اس کو نہ اندیشۂ ہجر　　دل افسردہ کو ہو عیش کہ غم ایک سا ہے

چھپ سکے زنداں میں دیوانہ ترا کیوں کر کہ ہو　　طوق پہنچانا ہوا زنجیر پہنچانی ہوئی

دکھانے کو لوگوں کے ہے یہ رکاوٹ　　نہ بیزار میں ہوں نہ بیزار وہ ہے

اے ظفر ڈرتا ہے جی تو بیقراری میں کہیں　　راز دل اپنا نہ کہہ بیٹھے کسی کے سامنے

ٹھنڈی ٹھنڈی جو کوئی سانس ہے آتی جاتی　　دل میں ہے آگ مرے اور لگاتی جاتی
عندلیبو کوئی دن اور ہے گلشن میں بہار　　دیکھو ہے باد خزاں خاک اڑاتی جاتی
ہوگیا آہ کا بھی منھ سے نکلنا موقوف　　دل میں ہے اپنے محبت جو سماتی جاتی
اے مسیحا نفس آنے کی ترے سن کے خبر　　رہ گئی جاں ترے بیمار کی جاتی جاتی
اے ظفر کھاتے ہیں ہم لوگ یہاں زخم پہ زخم　　گل نیا روز محبت ہے کھلاتی جاتی

یہ چرخ تفرقہ انداز دیتا ہے کہاں فرصت　　ظفر جو آشنا سے آشنا اب کوئی مل بیٹھے

کرتے ہیں آہ وہ نالہ جو ہم اٹھتے بیٹھتے　　الفت کا تیری بھرتے ہیں دم اٹھتے بیٹھتے
ہم ضعف سے ہیں ریگ کی دیوار کی طرح　　سو بار وقت درد والم اٹھتے بیٹھتے
ہوتے ہو چلتے پھرتے اگر آئے ہو یہاں　　غیروں میں تم ہو ہائے ستم اٹھتے بیٹھتے
بے طاقتی سے اپنا ہے یہ حال اے صنم　　مشکل سے ہیں خدا کی قسم اٹھتے بیٹھتے

ہے شیخ و برہمن کی رفاقت سے یہ غرض　　　　ہوجائے سیر دیروحرم اٹھتے بیٹھتے
مثل غبار راہ ترے ناتوان عشق　　　　ہستی سے پہنچے تا بہ عدم اٹھتے بیٹھتے
جاتا صنم کدہ میں ظفر گر مرا صنم
تعظیم کو سب اس کی صنم اٹھتے بیٹھتے

نہ بھائے نغمہ بلبل نہ بوئے گل ہم کو　　　　ترے فراق میں ہم ایسے بے دماغ بنے
جہاں چمن میں نشیمن تھے بلبلوں کے ظفر　　　　ہزار حیف کہ واں آشیانِ زاغ بنے

آہ کب سینہ سے اے ہم نفساں نکلے ہے　　　　دل میں اک آگ سلگتی ہے دھواں نکلے ہے
چرخ کھینچے ہے مرے سر پہ یہ تجھ بن شمشیر　　　　شب ہجراں میں کہاں کا ہکشاں نکلے ہے
آہ سوزاں سے جلا دیتا ہے گھر کتنے ہی　　　　جس طرف سے کہ ترا سوختہ جاں نکلے ہے
قفس ودام سے صیاد اسیروں کو نکال　　　　کہ بہار آئی ہے گلشن سے خزاں نکلے ہے
اہل دنیا کی ملاقات نہیں بے مطلب　　　　یہ وہاں جاتے ہیں کچھ کام جہاں نکلے ہے
ڈوبتا ہے جو کوئی عشق کے دریا میں ظفر
نہیں معلوم کہ وہ جا کے کہاں نکلے ہے

پابہ زنجیر اور دیوانہ ہے آیا کون سا　　　　یہ نہیں معلوم پر زنداں میں غل برپا تو ہے

جی قفس میں لگ گیا اپنا چمن سے بھی سوا　　　　ہم کو اے صیاد پروائے رہائی کیا رہی

کیا ہوگا اوراس سے زمانے کو انقلاب　　　　جو بات عیب کی تھی ہنر ہوگئی تو ہے

سلام

دیں نہ اے مجرئی اس شہ کو ستمگر پانی
جس کی ہوں تشنہ لبی دیکھ کے پتھر پانی

یاد کر پیاس کو شبیر کی تو اشک بہا
چاہتا کوثر و تسنیم سے ہے گر پانی

پانی پانی ہو خجالت سے نہ کیوں کر دریا
شاہ کا جب نہ لب خشک کرے تر پانی

کٹے پیاسا پسر ساقیٔ کوثر کا گلا
نہ ملے ہائے جز آبِ دم خنجر پانی

کہا شبیر نے اکبر سے دمِ تشنہ لبی
تم پیو جاکے سرِ چشمۂ کوثر پانی

کہا بانو نے کہ ہے ہے بجز آبِ پیکاں
نہ ملا مجھ کو مرے اے علی اصغر پانی

دیکھ سر بیٹے کا نیزے پہ جو روئے زہرا
دیوے سو نیزہ چڑھا عرش بریں پر پانی

اپنی آنکھوں سے چھڑکتے تھے بہا کر آنسو
ہر گل زخم پہ عباس کے سرور پانی

تھا یہ منظور نہ ہو امت عاصی پہ عذاب
پیتا کس طرح سے وہ جان پیمبر پانی

اے ظفر ہے غم شبیر میں روتا گردوں
ابر سے یہ جو برستا ہے زمیں پر پانی

بجھن

پیم اگن نت موہے جراوے یا کا بھید کہوں کا سے
پی ہو پاس تو جی ہو ٹھنڈا اپنی بپتا کہوں وا سے

رتیاں گجاروں روت روت دن کو گجاروں آہاں کھینچ
میرے من کی موسوں نہ پوچھو پوچھو میری بپتا سے

یا ہی برہا درجن ہووے یا ہی برہا سرجن ہووے
نا چھوٹے یا برہا موسوں نا چھوٹوں میں برہا سے

نیں کھلے کچھ اور ہی دیکھوں موندوں تو کچھ اور ہی کچھ
کوؤ وا کو سانچ نہ جانے دل کی بات کہوں جا سے

من کے اندر پیا قلندر تیرے ظفر وہ آن بسا
کام پڑو جب واسوں تہارو کام رہا کیا دنیا سے

دوہے

نا کوئی آیا ساتھ ہمارے نا گیا کوئی ساتھ
دیکھ کے لیکلا آپ تو کہہ دے مل مل اپنے ہاتھ

جن کے پیچھے جگ وچ ہم نے اپنا سب کچھ کھویا
انت سمے میں ان اپنوں میں سے اپنا کوئی نہ ہویا

بہتا چاہا ہم نے ہووے جگ وچ کوئی ہمارا
جب نا دیکھا کوئی اپنا کنیا سب سے کنارا

سب کے من میں کھوٹ ہے اور سب کی کھوٹی چال
کون لگا دے جیا اپنا ان لوگاں دی نال

ہووے اپنی قسمت کہاں جو تم سے لگاؤں آگ
آپ ہی تم نے موہے لگایا دھن دھن میرے بھاگ

دنیا ایک سرا ہے اس میں کر لو رین بسیرا
اپنے پاؤں پسارے تم نے کس غفلت نے گھیرا

شوق رنگ اس دنیا کا تو ہے سپنا کا سا لیکھا
کیا دیکھو گے سپنے میں اور دیکھا تو کیا دیکھا

اچھا اپنا ٹھور لگاؤ پھرو نہ ڈانواں ڈول
تھے وہ لوگ سیانے جتھاتے اکھے یہ دو بول
یہ نیناں ہرجائی یہ تو سب سے جائے اٹک دے
شوق رنگ اندے نال بھروگے کب لگ یونہی ٹھیک دے
یوں تو سب کے یار ہو تم اور سب سے رکھوے پیار
پر ہم جانیں پیارے تسانو جب ہے پورا پیار
رین تو ساری غفلت ہی وچ دینی تونے کاٹ
دن نہ گنواؤ دیکھو تسانو جانا اوکھے گھاٹ
قاصد بھیجوں کسو بھیجوں جانو ٹھور نہ ٹھانوں
ملک نہ جانوں، دیس نہ جانوں نا جانوں وہ گاؤں
لکھاں پتیاں لکھ چکی لکھ لکھ تھک گئے ہاتھ
پہنچیں ہیں یا نہ پہنچیں یہ کس سے پچھیاں بات
پھردی میری انکھیاں وچ ہیں وہ انکھیاں مدماتی
میں ناپیواں مدھ کا پیالا مینو مدھ نہیں ماتی
دیکھ کے سونی سیج پیابن بھر بھر اُلڈے نین
کچھ مت پوچھو لوگاں میں نے کیوں کر کٹدی رین

نوحہ

آج زینب نوحہ گر ہے وا دریغا وادریغ
پیٹتی سر ننگے سر ہے وادریغا وادریغ

گھر جلا، خیمہ جلا، بیٹھے کہاں جائے کدھر
اب نہ گھر ہے اور نہ در ہے وادریغا وادریغ

نور چشم ساقی کوثر ہے پیا سا دشت میں
خشک لب ہے چشم تر ہے وادریغا وادریغ

رہتا تھا جو سر کنار مصطفیٰ میں روز و شب
آج وہ سر نیزہ پر ہے وادریغا وادریغ

شہ نے صغرا سے کہا یہ لے خدا حافظ ترا
اپنا اب یاں سے سفر ہے وادریغا وادریغ

جسم پر اکبر کے میداں میں ہزاروں زخم ہیں
اور جو ہے کارگر ہے وادریغا وادریغ

باندھتا عباس غازی ہے جو مرنے پر کمر
ٹوٹتی شہ کی کمر ہے وادریغا وادریغ

کہتی ہے بانو کہ مارے پیاس کے دم توڑتا
اصغر تشنہ جگر ہے وادریغا وادریغ

نے کوئی ہے شیر کا قطرہ کہ منھ میں اس کے دوں
اور نہ پانی بوند بھر ہے وادریغا وادریغ

کان میں بالی سکینہ کی ہوئی لوہولہان
اور کرتا خوں سے تر ہے وادریغا وادریغ

اس طرح شمر ستمگر نے نکالا کھینچ کر
کان سے اس کے گہر ہے وادریغا وادریغ

قاسم نوشاہ کے جوڑے شہانے کے لیے
سرخیٔ خون جگر ہے وادریغا وادریغ

کہہ رہا دولہا ادھر ہے حسرتا واحسرتا
کہہ رہی ہے دولہن ادھر ہے وادریغا وادریغ

اے ظفر میں کیا کہوں کہتا غم شبیر میں
دل مرا آٹھوں پہر ہے وادریغا وادریغ

دیوان چہارم

صیاد تھا وہ کون سا طائر اسیر دام — ثابت جو تیرے ہاتھ سے پر لے کے اڑ گیا

دل بتوں سے لگا کے کیا پایا — دین و ایماں گنوا کے کیا پایا
جز غم و درد و یاس و رنج و تعب — ہم نے دنیا میں آ کے کیا پایا
اے اسیران خانۂ زنجیر — تم نے یاں غل مچا کے کیا پایا
نہ بجھا سوز دل جب آنکھوں سے — ہم نے دریا بہا کے کیا پایا
نہ جتانا تھا راز عشق ان سے — کیا جتایا جتا کے کیا پایا

گر نشیمنِ بلبل پہ تو نہ برق اے چرخ — بلا سے اس سے کوئی آشیانِ زاغ جلا

مرغانِ چمن کرتے ہیں کیا چہچہے دیکھو — وہ دوش پہ صیاد لیے دام ہے آتا

خبر اڑتی سی کچھ موسم گل کے جو آنے کی — تو کیا کیا حسرت پرواز میں مرغ قفس پھڑکا

سنتے ہیں باغ میں گری بجلی — جل گیا ہو نہ آشیاں اپنا

مر جاؤں گلا کاٹ کے میں ہجر میں اپنا — پر کیا کروں ظالم مجھے خنجر نہیں ملتا
یہ جوش بہار اور یہ گل اور یہ سبزہ — پر حیف کہ ساقی ہمیں ساغر نہیں ملتا

سنا رنج و تعب کا حال سارا میرے یاروں نے — نہ پوچھا یہ کسی نے باعث رنج و تعب کیا تھا

دیکھ لے گل کو تو کہ وقت خزاں — سر پہ اے عندلیب آ پہنچا

وہ نہ ہے مے میں نہ ہے وہ مے پرستی میں مزا   جو نگاہ مست ساقی کی ہے مستی میں مزا
دیکھ ہے کیا ابر و باراں ساقیا دے بھر کے جام   مے کے پینے کا ہے اس بدلی برستی میں مزا
چھوڑ کر کعبے کو آتے ہیں جو بت خانے میں ہم   اے ظفر آتا ہے کچھ تو بت پرستی میں مزا

کہاں وہ مہ جبیں اور ہم کہاں وہ وصل کی راتیں   مگر ہم نے کبھی تھا ایک یہ بھی خواب سا دیکھا
ظفر کی سیر اس گلشن میں ہم نے پر کسی گل میں   نہ کچھ الفت کی بو پائی نہ کچھ رنگ وفا دیکھا

کوئی غم خوار کوئی مونس و ہمدم کوئی   پاس اپنے نہیں جز رنج و غم آتا جاتا

امید روز وصل میں کچھ زندگی ہوئی   اپنا شب فراق میں جینا محال تھا

فلک کے نیچے فلک اور اک نیا بن جائے   جو پہنچے درد جگر میرا آسماں کے قریب
وہ ہوں میں طائر آتش نفس کہ تھرائے   جو آئے برق کبھی میرے آشیاں کے قریب
قفس سے چھوٹ کے جب ہم اسیر اے صیاد   چمن میں پہنچے کہ دن آگئے خزاں کے قریب

نام ہے بدنام مے کا ورنہ اس سے بھی سوا   مست ہو جاتا ہے انساں نشۂ دولت کے وقت

جواب دے ہے مجھے لو سنو طبیب کی بات   یہ اس کی بات نہیں ہے مرے نصیب کی بات
کریں جو ہم ترے دوری میں نالہ و فریاد   یہ شور ہو کہ سنائی نہ دے قریب کی بات
کرو وہی کہ جو کرنا ہے آپ کو منظور   مگر سنا تو کرو تم کسی غریب کی بات
کلام اشرف و ارزل میں فرق ہے کہ کہاں   صدائے زاغ میں آواز عندلیب کی بات
مجھے ہے ڈر کہیں ایسا نہ ہو دل بیتاب   عدو کے سامنے کہہ بیٹھے کچھ حبیب کی بات

رہا ہوئے بھی تو کیا وقت بے پروبالی　　　رہے قفس ہی میں ہم حیف بال و پر کے وقت

دعویٰ کبھی نہ کرتے محبت کا بوالہوس　　　ہوتی وفا کی تجھ کو گر اے بے وفا شناخت

قطعہ

جو ایک ڈھنگ پہ ہو بات تو کہا جائے　　　سمجھ میں آتی نہیں شوخ مہ جبیں کی بات
اگر زمیں کی پوچھوں تو آسماں کی کہے　　　جو آسماں کی پوچھوں کہے زمیں کی بات

جانو کہ محتسب کے ہے قبضے میں میکدہ　　　دکانیں آج بادہ فروشوں کی گر ہیں بند

صیاد یہ دعا ہے نہ ہم کو خدا دکھائے　　　دام و قفس کوئی ترے دام و قفس کے بعد

سینے میں اس طرح دل تڑپے ہے تجھ بن اپنا　　　جیسے کہ مرغ وحشی پھڑکے قفس کے اندر

چمن سے توڑ کے پھولوں کو لے چلا گلچیں　　　کہو کہ چھین لے ہاتھ اس کا باغباں مروڑ

اے ظفر یوں ہیں اسیران قفس حیرت میں　　　ہووے جس طرح سے دیوار گلستاں پر نقش

ہم نے رنج اتنے سہے باقی رہا کوئی نہ رنج　　　ہم نے غم کھائے یہاں تک ہو گیا اب غم کا قحط

ہم پھڑک کر دام کے صیاد دیں ٹکڑے اڑا　　　پر ذرا ہم کو ہے اپنے بال و پر کی احتیاط

مبادا چونک اٹھے خواب ناز سے وہ گل　　　چمن میں جائیو اے باد صبح دم بہ لحاظ

کی توبہ مے کے پینے سے مدت ہوئی مگر اب تک شراب کے ہیں مرے پیرہن پہ داغ

اٹھ گیا ہے کون پہلو سے کہ گھبرائے ہوئے دیکھتے ہیں گھر میں ہم دیوار و در چاروں طرف

دامن چھڑانا اپنا ہو دشوار برق کو گر آئے آشیاں کے مرے خار و خش تلک
احساں کرے اسیر قفس پر نسیم صبح اک برگ گل جو لائے چمن سے قفس تلک

ہم سے زمانہ آج اگر پھر گیا تو کیا لاکھوں ہی اس کے دیکھ چکے انقلاب ہم

رلاتا ہے مجھے کیا کیا خیال اس چشم میگوں کا اگر میں ہاتھ سے ساقی کے کوئی جام لیتا ہوں

منہ پر ظفر ہے اپنے کالی چادر اپنے اشکوں کی کنج غم میں منہ پہ دوپٹہ تاننے والے اور ہی ہیں

ریزۂ مینائے سبزہ زیر پا اس گل بغیر ہم نہیں رکھتے کبھی باغ ارم میں پاؤں ہیں

ہے جی میں چنگ چرخ پہ میں کہکشاں کا تار مضراب نالہ دل مضطر سے چھیڑ دوں

دور ابھی ہے موسم گل اور جنوں کے ہاتھ سے تار ثابت ایک بھی اپنے نہیں یاں جیب میں

صیاد پر جفا ہے زمانہ مرے لیے اس سے بچاؤ تا نہ گرفتار دام ہوں

قفس میں بند ہے کیا جانے کون سا طائر صدائیں آتی مگر عندلیب کی سی ہیں

نکل کر خانہ زنجیر سے دیوانگی میں ہم　　نہیں ہیں مثل آواز سلاسل اپنے کہنے میں

جس کو حال دل پر درد سناتے ہم ہیں　　آپ بھی روتے ہیں اوراس کورلاتے ہم ہیں
ہربُن موسے نکلتے ہیں ہزاروں شعلے　　سوزش عشق کو کیا خاک چھپاتے ہم ہیں
نہ تبسم نہ تکلم نہ اشارہ نہ نگاہ　　ان پہ کیوں آپ کو دیوانہ بناتے ہم ہیں
کب تلک ظلم اٹھائیں تری فرقت میں جان　　بے بس اب جان ہی سے ہاتھ اٹھاتے ہم ہیں

جیب کو میں رفو کروں چاک اگر ہوناصحو　　چھوڑے سنا ایک تار بھی دشت جنوں تو کیا کروں

کیسا رنج اور کیسی راحت، کیسی خوشی اور کیسا غم　　یہ بھی نہیں معلوم مجھے میں جتیا ہوں یا مرتا ہوں

ہیں اب کہاں ہمارے وہ سیر چمن کے دن　　کرتے بسر ہیں ہجر میں اس سیم تن کے دن
جب عشرت ونشاط کا موسم گزر گیا　　تو کیا گزر نہ جائیں گے رنج ومحن کے دن
ٹیڑھے جو ہو کے تم سے کہیں کچھ وہ اے ظفر　　بولو نہ تم کہ ان کے ہیں یہ بانکپن کے دن

ہوئی جس سبب ہم سے تم سے جدائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
بیاں یہ تو کردے گی ساری خدائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
یہ مشہور ہے دل سے ہے راہ دل کو کیا کرتا ہے دل ہی آگاہ دل کو
وہ دل ہی سے پوچھو جو ہے دل میں آئی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
ہمیں چاہو تم اور ہم تم کو چاہیں ادھر تم نباہو ادھر ہم نباہیں
سوا اس کے رسم ورہ آشنائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
پہیلی سی اک رسم مہر ووفا ہے اسے پوچھتا ہے تو دل بوجھتا ہے
نہیں جاتی منھ سے یہ ہرگز بتائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں

جو قصد اس گلی کا ہے اے حضرت دل تو پوچھے سے تدبیر کیا ہوگا حاصل
چلو واں کریں چل کے بخت آزمائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں
بلا سے کوئی گر برا یا بھلا ہے تمھیں کیا غرض اور ہمیں کام کیا ہے
ظفر اب کسی کی برائی بھلائی نہ تم ہم سے پوچھو نہ ہم تم سے پوچھیں

جو ہوے رہ نورد شوق کیا ہو اس سے خودداری ... کہ بوئے گل کہاں وقت سفر ہے اپنے قابو میں

آنکھوں میں روتے روتے نم بھی نہیں ہے اب تو ... تھے موجزن جو پہلے طوفان اب کہاں ہیں

بنے ہیں جام وسبو ان کی خاک سے ساقی ... جو رند خواہش جام وسبو میں مرتے ہیں

پہلو میں بیٹھے بیٹھے وہ جاناں جو اٹھ گیا ... ٹھنڈی سی سانس بھر کے کہا دل نے ہائے جان

یار نہیں غم خوار نہیں ہمدرد ظفر اب کوئی نہیں ... کنج غم میں آپ ہی کہیے دل کو مرے بہلائے کون

رحم کچھ آئے جو اس اشک پری کے جی میں ... کیوں کہ جی ڈالیے پر اپنا کسی کے جی میں
نہ ملا قطرۂ مے دور میں تیرے ساقی ... خون دل بیٹھ رہے اپنا ہی پی کے جی میں
کوئی سمجھائے اسے میری طرف سے غم خوار ... آتی اتنی نہیں افسوس کسی کے جی میں
وہ جو آنکلے تو سارے ہی فراموش ہوئے ... بھر رہے تھے مرے شکوے جو کسی کے جی میں
وہ جو آئے بھی تو کیا آئے نہ دم بھر ٹھہرے
اے ظفر رہ گئے ارمان تو جی کے جی میں

پروانے کو جلا کے کیا خاک بزم میں ... لگ جائے آگ شمع ترے التفات کو

کوچے میں عشق کے ہیں برابر شہ وگدا　　　کب پوچھتا ہے واں کوئی ذات وصفات کو

چھٹیں بھی ہم قفس سے تو کہے یہ بے پروبالی　　　کہاں جاؤگے یاں سے اے اسیرو چھوٹ کر ٹھہرو

محتسب میخانے میں آیا لیے سنگ ستم　　　ساقیا بس ہاتھ اب تو شیشۂ وساغر سے دھو

مانند نکہت گل عمر اپنی اس چمن میں　　　کی جس طرح سے ہم نے برباد کچھ نہ پوچھو

قتل عالم کو کرو تم اور قضا کا نام لو　　　اے بتو تہمت نہ لو دیکھو خدا کا نام لو
غم مجھے کھانے کو دو اور خون دل پینے کو دو　　　اے طبیبو نے غذا کا نے دوا کا نام لو
جو تمہارے جی میں آئے ناصحو فرماؤ تم　　　پر نہ میرے سامنے ترک وفا کا نام لو
حضرت دل اب کی گر جیتے چھٹو اس زلف سے　　　پھر نہ جیتے جی تم اس کالی بلا کا نام لو
اے ظفر چشم ونگہ یا غمزہ وناز و ادا
کون دل کو لے گیا اس دلربا کا نام لو

لاتے ہو کیوں حضرت دل یہ شکوہ دس میں جانے دو
جاتی رہیں گر الفت کی وہ پہلی رسمیں جانے دو
جائے گا کیوں کرتا بہ چمن صیاد ولے بے بال وپر
جائے اگر پھر الٹا پھر کر دام وقفس میں جانے دو
کرتے ہو اس سوختہ جاں کو دیکھو کیوں سرگرم فغاں
دے گا جلا یہ سارے جہاں کو ایک نفس میں جانے دو
پارۂ دل اے اشکو ہیں یہ پارۂ آتش مژگاں پر
آگ لگاؤ دیکھو نہ تم اس خاروخس میں جانے دو

اپنے دل دیوانہ کو سمجھاؤ ظفر اوراس پر بھی
جاہی پڑے اس رشک پری کے گر یہ بس میں جانے دو

راہنما میں تم کو اپنا جانتا ہوں اے حضرت عشق　　　میرے ہادی میرے مرشد میرے مولا تم ہی تو ہو

عیش وطرب میں کوئی دم تم اور بسر ہولینے دو
جاتے کہاں ہو رات ابھی ہے دیکھو سحر ہولینے دو
ہاتھ ابھی سودائے وفا سے تم نہ اٹھاؤ حضرت دل
ہونا جو کچھ قسمت میں ہے سود و ضرر ہولینے دو
جائے تڑپنا کیوں کہ تمہارے صید ناوک خوردہ کا
ٹھنڈا اس کو کھانے ابھی تم تیر نظر ہو لینے دو
آخر تو پھر تیغ ستم کے وار ہمیں پر ہوویں گے
اور کوئی گر ہوتا ہے اب سینہ سپر ہولینے دو
جب میں نچوڑوں دامن اپنا کتنے ہی دریا جاری ہوں
اشکوں سے اے آنکھوں اس کو اتنا تر ہولینے دو
جاتے کہاں ہو بالیں سے تم اپنے مریض الفت کی
ٹھہرو کوئی دم یا تو اِدھر یا اس کو اُدھر ہولینے دو
اس کے اٹھا کر ظلم ابھی سے تم نہ اٹھاؤ جان سے ہاتھ
اور ستم ہوں جو کچھ باقی وہ بھی ظفر ہولینے دو

جلادیں باغ سارا اک نوائے آتشیں سے ہم　　　صبا دامن کش برق اپنا خار آشیاں کیوں ہو
قلق سے پھوڑنے کو سر ہزاروں اور پتھر ہیں　　　لہو سے میرے آغشتہ وہ سنگ آستاں کیوں ہو

کیا تم نے جو میرے ساتھ اپنے دل سے وہ پوچھو
مجھے بس چپ ہی تم رہنے دو کھلواتے زباں کیوں ہو

نہ رہی دشت نوردی کی جو طاقت تو جنوں — کنج زنداں ہی میں پھر تو نے بٹھایا ہم کو
عمر کی ہم نے بسر بے ہنری میں یوں ہی — وائے قسمت نہ ہنر کوئی بھی آیا ہم کو
شورِ محشر سے نہ بیدار ہوں اے مستیٔ عشق — اس قدر تو نے تھپک کر ہے سلایا ہم کو

پڑے جس جا پہ تری زلف دوتا کا سایہ — نہ رہے نام کو واں اور بلا کا سایہ
دل دیا ہم نے ہے اس مہر لقا کو اپنا — کہ پڑا جس پہ نہیں مہر و وفا کا سایہ

منہ کھلتے ہی شیشہ کا اڑ جائے ہے اے ساقی — بوئے مئے گلگوں ہے مرغ قفس شیشہ

پھرے ہے موج ہوا ساقیا لیے شمشیر — نہیں بجز سپر جام اس ہوا کی پناہ

اس جہاں میں آ کے ہم کیا کر چلے — بار عصیاں سر پہ اپنے دھر چلے
تو نہ آیا اے مسیحا دم یہاں — ہم اسی حسرت میں آخر مر چلے
اس گلی میں ہم تو کیا خورشید بھی — ڈر کے مارے کانپتا تھر تھر چلے
اس قدر پیک صبا میں دم کہاں — ساتھ اس آوارہ کے دم بھر چلے
لے چلے کیا اس چمن سے غنچہ ساں — ہم تو کیسہ اپنا خالی کر چلے
اور تو چھوڑا یہیں کا سب یہیں — ایک تیرا داغ ہم لے کر چلے

دل ہی قابو میں نہیں جب اے ظفر
تم وہاں کس کے بھروسے پر چلے

اک گل بھی دیکھنے کو نہیں اے صبا کہیں   ویراں کیا خزاں نے یہ گلشن کو لوٹ کے
توڑے ہے شیشے میکدہ میں محتسب مدام   ساقی پڑے خدا کا غضب اس پہ ٹوٹ کے

ہر جائے ہے قدرت کا تماشا مرے آگے   لیکن مری غفلت کا ہے پردا مرے آگے
وہ دام میں شہرت کے ہے میں دام سے آزاد   جا سکتا کہاں اڑ کے ہے عنقا مرے آگے
کچھ کہتا نہیں منھ سے کہ مایوس ہے ناصح   صورت کو مری تکتا ہے بیٹھا مرے آگے
بس اب رہ ناکامیٔ الفت میں رہا ہوں   اٹھنے ہی نہیں پائی تمنا مرے آگے
کرتا ہوں جو میں شکوہ جفا کا تو کہے ہے   پھر نام کبھی لیجو وفا کا مرے آگے
خاک قدم یار مرے سجدہ کی جا ہے   یہ نقش کف پا ہے مصلا مرے آگے
میں وہ متحمل ہوں گرانباری غم کا   ہے کوہ بھی اک کھیل سے ہلکا مرے آگے

ہو جائے گا قفس میں مبدل وہ رنج سے   گلشن میں جو نصیب عنادل سرور ہے

ٹھنڈا ذرا صبا دل بلبل نہ کر سکے   یعنی چراغ گل وہ کبھی گل نہ کر سکے
دل اس ستم شعار پہ کیوں ہو فریفتہ   جس کے ستم پہ صبر و تحمل نہ کر سکے

خدا کے واسطے زاہد اٹھا پردہ نہ کعبہ کا   کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

جو پھڑکے مرغ گرفتار اک ذرا صیاد   چمن میں توڑ کے یہ تیرے جال کو پہنچے

معطر کر دیا سارے چمن کو ایک جھونکے میں   خدا جانے صبا کس گل کی نکہت لے کے آئی ہے

نہیں گر دلخراش اے گل چمن میں نالۂ بلبل   تو کیوں سینہ سراسر چاک تیرا ہو گیا یوں ہے

خدا جانے کیا کیا سحر اس چشم پرافسوں نے
ظفر جو دل تمہارا بس میں اس کے آ گیا یوں ہے

ہم اس کی چشم کو دیں کیوں کہ اپنا شیشۂ دل
کہ ہے وہ مست کہیں ہاتھ سے نہ چھوٹ پڑے

کیا کہوں شب کو مرے گریہ کی حالت اور تھی
روکنے سے آنسوؤں کے ہوتی شدت اور تھی

بزم یاران گزشتہ کی نہ پوچھو دل لگی
تھے وہ جلسے اور یارو اور وہ صحبت اور تھی

اے ظفر اچھا کیا تم نے کہے اسرار عشق
ورنہ تھی ان کے چھپانے میں قباحت اور تھی

تاب یہ کس کو لگائے ہاتھ تیری زلف کو
ہیں ہمیں اے کافر اس کالے کا منتر جانتے

ناصحو دیکھنا تم سیر بہار آنے دو
پہنچے گی دشت میں لے کر مجھے وحشت سیدھی

بار اندوہ مرادہ ہے کہ جس کے آگے
نہ ہوئی پست فلک تا بہ قیامت سیدھی

نہ کر خیال کہ آئی گھٹا بہت سی ہے
ابھی تو شیشے میں مے ساقیا بہت سی ہے

الٰہی خیر ہو شامت نہ دل کی آ جائے
کہ برہم آج وہ زلف دوتا بہت سی ہے

کہوں میں کیا کہ گزرتی ہے دل پہ کیا تجھ بن
یہ داستان غم اے دلربا بہت سی ہے

کبھی ہمارا بھی خوں مل کے دیکھو ہاتھوں میں
لگائی آپ نے یوں تو حنا بہت سی ہے

پلائے گا کوئی جام مئے طرب ساقی
طبیعت آج مری بے مزا بہت سی ہے

کہو شرار سے ہنستا ہے کیا شرارت سے
کہ تیری ہستی پہ ہنستی فنا بہت سی ہے

حیات عشق میں کرنی بسر ہمیں اپنی
ظفر اگرچہ ہے تھوڑی سی یا بہت سی ہے

کہاں بستر گل گزرتی ہے شب بھر
مجھے کروٹیں خاک پر لیتے لیتے

اے بلبلو اتنا نہ کرو غل کہ مبادا — دشمن ہو سوا جان کا صیاد تمہاری

ترے ہاتھوں سے ہم اے سنگدل اس نالۂ دل کو — شکست شیشۂ دل کی ہیں اپنے اک صدا گنتے

عجب وہ قلندر ہیں آزاد جن کو — نا امید دنیا نہ پاس فقیری
سوال ان سے کر تو نہ دنیائے دوں کا — فقیروں سے کر التماس فقیری

میرے ان کے ہے جو کچھ مہر و محبت رہ گئی — ہے فقط اک دور کی صاحب سلامت رہ گئی
جو کبھی ہم سے حقیقت وہ ہی اس نے غیر سے — فی الحقیقت اب ہماری کیا حقیقت رہ گئی
وعدہ آنے کا کیا آیا نہ وہ محشر خرام — آتے آتے سر پہ عاشق کے قیامت رہ گئی
اٹھ گئے منعم جہاں سے چھوڑ کر قصر و محل — عاقبت یاں کی یہیں ساری عمارت رہ گئی
منھ کو کیا پھیرے پڑا ہے آ گلے لگ جا مرے — رات کچھ تھوڑی سی ہی اے ماہ طلعت رہ گئی

سخت جانی نے مری توڑی تو اس قاتل کی تیغ
اے ظفر دل میں تمنائے شہادت رہ گئی

حقیقت کو ہماری عشق کی پہنچیں تو کیا پہنچیں — کہ واں تک ناصحوں کی عقل دیوانی نہیں جاتی
بھلا کر تو بھلا ہوگا صدا سن بے نواؤں کی — نہیں یہ بات کچھ ایسی کہ جو مانی نہیں جاتی
یہ نقشہ ہوگیا ہے میرا سودائے محبت میں — مری صورت مرے یاروں سے پہچانی نہیں جاتی
گزر جائے نہ کیوں کر جان سے قاصد کہ جاناں تک — خبر مشکل سے جاتی ہے بآسانی نہیں جاتی
طبیعت ہے جواں پیری میں بھی وہ اے ظفر تیری — سخن فہمی، سخن سنجی سخن دانی نہیں جاتی

ہوگئیں سب باتیں الٹی واہ رے یہ انقلاب — بات تھی جو عیب کی اب وہ ہنر کی بات ہے

میں نے کہا جو بزم میں شب اپنا سوز دل — بے اختیار شمع کے آنسو نکل پڑے
شب نالہ کرتے ڈرتے ہیں ہم کوئے یار میں — ایسا نہ ہو کہ نیند میں اس کی خلل پڑے

ہے اختیار تمھیں مانو یا نہ مانو پر — جو ہم کہیں اسے تم سن تو لو خدا کے لیے

اے صبا یہ بھی غنیمت ہے قفس سے پس مرگ — اڑ کے دو چار چمن میں مرے پر جا پہنچے

حسن میں ہے تری یوسف سے شباہت ملتی — شکل سے شکل ہے صورت سے ہے صورت ملتی
کیوں کہ ہر ایک کو ہیں داغ محبت کے نصیب — کہ کسی کو ہے نصیبوں سے یہ دولت ملتی
کبھی گلشن کی طرف چاک قفس سے جھانکیں — ہم اسیروں کو نہیں اتنی بھی رخصت ملتی
خاک مجنوں کی بگولے میں پھرا کرتی ہے — عشق میں خاک بھی ہو کر نہیں راحت ملتی
یار جو ملتے ہیں اغیار ہی ملتے ہیں ظفر — کیا ملیں ان سے نہیں اپنی طبیعت ملتی

دیکھ کر جس کو ید بیضا خجل ہو اے نگار — وہ ترے دست حنائی میں حنا کا چور ہے

تجھ کو کیا کوئی بلا سے گریہ وزاری کرے — سنگ دل ایسا نہ ہو تو اپنا دل بھاری کرے
جز غم عشق اور ہے غمخوار ایسا کون سا — کلبۂ احزاں میں جو وہ میری غمخواری کرے
صبح محشر شام ہو گریہ ترا آفت زدہ — جو مصیبت اس پر گزری ہے بیاں ساری کرے
یوں تو ہیں دلدار دنیا میں بہت اے ہم نشیں — پر نہیں کوئی کہ جو دل لے کے دل داری کرے
شیشۂ دل میرا نازک ہے اگر وہ مست ناز — لے چلا ہے تو کہو اس کی خبر داری کرے

کی تو ہے تدبیر کچھ یاروں نے وصل یار کی
اے ظفر میرا مقدر بھی اگر یاری کرے

ہم یار کس کو سمجھیں کس کا کریں بھروسا ہے دل جو دوست اپنا وہ بھی تری طرف ہے

قسم ملنے کی کھائی تو نے کیوں ہم باوفاؤں سے ارے او بے مروت گر قسم کھاتے تو ہم کھاتے
ظفر بل اس قدر کیوں کھائے اس کافر کی زلفوں نے ہم اس کے بیچ میں تھے پیچ و خم کھاتے تو ہم کھاتے

کھولا تو نے راز مرا اے دیدۂ پرنم سارا ہے
ہو گیا واقف حال سے میرے اب تو عالم سارا ہے
مجھ سے پھرا ہے سارا زمانہ جب سے پھری ہے تیری نگاہ
زلف ہے تیری جب سے برہم برہم عالم سارا ہے
ابر ہوا ہے سبزہ و گل ہے جام و سبو ہے شیشہ ہے
آج تو ساماں بادہ کشی کا ساقی جم جم سارا ہے
ہووے کیا سیراب وہ میکش دے تو اگر اک ساغر مے
پی جانا جو خم کا خم اے ساقی یک دم سارا ہے
سینے میں میرے زخم بہت ہیں چارہ گروں سے پوچھو تو
تم نے بنایا آدھا ہے یا نسخۂ مرہم سارا ہے
بعد ہمارے کون کرے گا اتنی ظفر غمخواری غم
غم زدگان عشق کو اس کے ہے تو یہی غم سارا ہے

میکشوں کے حال پر روتے ہیں کیا کیا مے فروش محتسب نے جو لگایا ہر دکاں پر قفل ہے

رو رو کر گر چشم سے دریا ہم نے بہائے کیا حاصل وہ جو دل کا داغ ہے اپنے مشکل اس کا دھونا ہے

گھر میں تجھ کو جو نہیں دیکھتا عاشق تیرا در و دیوار کو حیرت سے پڑا دیکھتا ہے

کیا غیروں نے کیوں بدنام کہہ کر بے وفا تجھ کو   یہ تیرا نام اے بیداد گر لیتے تو ہم لیتے
کسے دیتا وہ ساقی ساغرے ہاتھ سے اپنے   مگر قسمت سے اپنے اے ظفر لیتے تو ہم لیتے

یہ نہیں رنگِ حنا چھٹ جائے جو دو روز میں   حشر تک چھوٹے گا عاشق کا نہ لہو ہاتھ سے

آج کیا جانے کہ میخانے پہ کیا پتھر پڑے   ہیں کہیں ٹوٹے ہوئے شیشے کہیں ساغر پڑے
یار کیا جانے کہ کیسی ہے مصیبت عشق کی   اس کو جانے تو وہی جانے کہ یہ جس پر پڑے
کوئے قاتل میں قدم رکھنا سنبھل کر اے ظفر   ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں لاکھوں سر پڑے

شکر کہ بعد اک مدت کے پھر ساقی اپنے کانوں میں
بزم سے تیرے آج صدائے خندۂ قلقل آئی ہے

مرغ چمن ہے نغمہ سرا، ہے صحن چمن میں شور بپا
جوش گل ہے کیا کہ بہار مستی بلبل آئی ہے

جوش جنوں میں جیسے نکل آتا ہوں میں باہر زنداں سے
ساتھ مرے زنجیر بھی میری کرتی ہوئی غل آئی ہے

جتنا وہ حال دل سے غافل اتنا ہی مائل اس پر دل
دل کو پسند اب اس کی ظفر جو طرزِ تغافل آئی ہے

چمن میں تا نہ ہو گلچیں گلوں پر دست دراز   اٹھاتی ہاتھ ہے ہر شاخ گل دعا کے لیے

صبح رو رو کے شام ہوتی ہے   شب تڑپ کر تمام ہوتی ہے
سامنے چشم مست ساقی کے   کس کو پروائے جام ہوتی ہے
کوئی غنچہ کھلا کہ بلبل کو   بے کلی زیر دام ہوتی ہے

تھی جو خدمت جنوں کی مجنوں کو سو وہ اب میرے نام ہوتی ہے
پانی پانی لبوں سے اس کے ظفر کیا مئے لالہ فام ہوتی ہے

نالے اس نے جو گلستاں کی ہوس میں کھینچے تسمے صیاد نے بلبل کے قفس میں کھینچے
یوں تن زار سے عاشق کے کرے عشق نمود شعلہ سر جیسے لپٹ کر کوئی خس میں کھینچے

آشنا گردش زدوں کے ساتھ اے ناداں نہ ہو کیا سنو گے مل کے دیکھا آب رواں گردش میں ہے
مثل تصویرات فانوس خیالی زیر چرخ کون ہے آرام سے جو ہے میاں گردش میں ہے

کھائی ہے بولنے کی جو تو نے قسم نہ بول لیکن ادھر تو آنکھ اٹھا دیکھ تو سہی
کہتا ہے دل نہ دے اسے میں کس طرح نہ دوں ناصح تو اس کے ناز و ادا دیکھ تو سہی
رنگین ہیں یہ گل جو چمن دہر میں ظفر ہے بھی کسی میں رنگ وفا دیکھ تو سہی

اب تو تھامے سے دل بیتاب تھم سکتا نہیں تھم سکا جب تک یہ ہم سے ہم نے رکھا تھام کے
عشق کے کوچے میں تم رکھتے تو ہو اپنا قدم اے ظفر لیکن ذرا یاں پاؤں رکھنا تھام کے

کہاں وہ دور عیش افزا جہاں ہم تھے وہاں تم تھے
نہ رہتے تھے کبھی تنہا جہاں ہم تھے وہاں تم
عجب عالم تھا جب وہ زیب افزا بزم عشرت میں
برنگ ساغر و مینا جہاں ہم تھے وہاں تم تھے
مثال شمع و پروانہ بہم سرگرم دل سوزی
ہمیشہ انجمن آرا جہاں ہم تھے وہاں تم تھے

بلا سے گرچہ ہم روتے تھے اور تم ہم پہ ہنستے تھے
ولیکن ابر و برق آسا جہاں ہم تھے وہاں تم تھے
جدائی بھی جو ہوتی تھی تو صدقے اس تصور کے
اٹھا کر آنکھ جب دیکھا جہاں ہم تھے وہاں تم تھے
نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ ہے وہ وصل کا عالم
ظفر کہتا ہے اب بے جا جہاں ہم تھے وہاں تم تھے

جو سوز دل سے ہر ہڈی کو تن میں آگ لگتی ہے
تو پھر گویا کہ اک بانسوں کے بن میں آگ لگتی ہے
بلند اک شعلہ ہوتا ہے ابھی جو آہ سوزاں کا
تو پھر نہ خیمہ چرخ کہن میں آگ لگتی ہے

زباں پر اس بت بے مہر کا گر نام آتا ہے
خدا جانے یہ کیا ہے دل کو اک آرام آتا ہے
تصور میں جو عالم ہے قیاس و وہم سے باہر
وہ آنکھوں سے نظر تجھ کو بت خودکام آتا ہے
گلوں کے منہ پہ گویا اوس پڑ جاتی ہے گلشن میں
مے گل رنگ پی کر جب کہ وہ گلفام آتا ہے
وہ بحر بیکراں دریائے الفت ہے نظر جس کا
نہ کچھ انداز آتا ہے، نہ کچھ انجام آتا ہے
ہمارا طائر دل زلف کے پھندے میں کیا آئے
ظفر یہ مرغ زیرک کب بہ زیر دام آتا ہے

ہم نئے ہی آج اے صیاد کیا پکڑے گئے
بارہا چھوٹے قفس سے بارہا پکڑے گئے
زلف کو چھیڑا صبا نے ہے ہماری کیا خطا
ہم گرفتار بلا ہیں بے خطا پکڑے گئے
جیتے جی چھوٹے نہ زندان محبت سے کبھی
ایسی ساعت سے تمہارے مبتلا پکڑے گئے

ایسے مانوس ہیں وحشی ترے تنہائی سے
اپنے سایہ کو بھی ہیں دیکھ کے وحشت کرتے
دل کو کیوں پھینک دیا لیکے ہمارے تم نے
گر برا تھا تو ہمیں کو یہ عنایت کرتے

نے گل کو یاں ثبات نہ شبنم کو ہے قرار　　کیا روئے اس چمن میں کوئی اور کیا ہنسے

وہ کیوں نہ تنگ ہوں جن کو پاس شرم ظفر　　کہ اس زمانے میں ہیں چین مسخرے کرتے

گو نہیں آتا بھلائی سے برائی کے سوا　　ہم نشیں میرا خیال اس کو مگر آتا تو ہے

مار ہی ڈالتا صیاد ہمیں پھڑکا کر　　گر کبھی بھول کے ہم نام رہائی لیتے

اور تو باتیں تمہاری خیر خاصی تھیں نہ تھیں　　ترک الفت کی مگر اے ناصحو خاصی کہی

بے وفائی پہ مر گئے تیری　　بے وفا یہ وفا ہمیں سے ہوئی
گزرے سر سے نمازِ عشق میں ہم　　ہوئی گریہ ادا ہمیں سے ہوئی
دل بلبل میں تھا نہ درد ظفر　　وہ بھی درد آشنا ہمیں سے ہوئی

گر اسیروں کو یونہی صیاد تو پھڑکائے گا　　تو نکل بھاگیں گے وہ اک دن قفس کو توڑ کے

ہے یہ کھٹکا دیکھ کر گل کو نہ ہو شادیٔ مرگ　　جب قفس سے چھوٹ کر گلشن میں بلبل جائے گی

قصۂ غم ہے دراز اتنا جو کہنے بیٹھیں　　ہو چکیں حشر کئی پھر رہے کہنا باقی
مل رہیں گے ترے کوچے میں کبھی دلبر ہم　　یار باقی ہے تو صحبت ہے دلآرا باقی
صحبت گل سے ہزار اس کو ہوا اطمینان　　دل بلبل میں ہے صیاد کا کھٹکا باقی

ایک مدت سے مری خاک کی مٹی تھی خراب　　بارے اس کوچے میں اے باد سحر پہنچ گئی

صیاد خاک ہو پھر اس کو ہوائے پرواز　　پر ہی گئے اسیر دام محن کے کترے

خواب تھا جو زندگی جاہ وحشم میں کٹ گئی　　ورنہ ساری عمر اپنی درد وغم میں کٹ گئی

حاصل عمر ایدائے خضر ہم سمجھے اسے　　جو گھڑی آرام سے بزم صنم میں کٹ گئی

کبھی زانو پہ ہے ہیہات کبھی سینے پر　　ہائے وہ ہاتھ کہ تھا گردنِ جاناں کے تلے

آزاد کب کرے ہمیں صیاد دیکھئے　　رہتی ہے آنکھ باب قفس پر لگی ہوئی

ساقی آئے شتاب میرے لیے　　لائے جام شراب میرے لیے
ہوں وہ میکش کہ چرخ لاتا ہے　　ساغر آفتاب میرے لیے

ظفر جو پہنچے وہاں ہم خدا خدا کر کے　　تمام عمر نہ پھر کوچۂ بتاں سے گئے

نہ تنگ کیوں ہمیں صیاد یوں قفس میں کرے　　خدا کسی کو کسی کے یہاں نہ بس میں کرے

بلند آہ کا شعلہ جو دل سے ہو تو خاک　　جلا کے خیمہ گردوں کو اک نفس میں کرے

میرے نزدیک ظفر بادہ پرستی اچھی　　پر نہیں ہے مئے پندار کی مستی اچھی
خانۂ دل میں مرے تیری بدولت اے عشق　　کیا ہجوم غم وحسرت سے ہے بستی اچھی

ظفر آتی ہے جان بلبل میں　　جب قفس میں ہے بوئے گل آتی

سوال مسئلہ عشق جب کیا ہم نے نہ بولے کچھ علماء لاجواب ایسے ہوئے
چھپے ہی پھرتے ہیں آبِ بقا کو پی کر خضر رہے نہ کام کے وہ کامیاب ایسے ہوئے

قطعہ

کاٹتے دن ہیں جو ہم باعث غم گن گن کر
شب بھی کرتے ہیں بسر تاروں کو ہم گن گن کر
کوئے جاناں کی زمیں اپنے پکڑتی ہے پاؤں
ہم ظفر اس لیے رکھتے ہیں قدم گن گن کر

سلام

باندھی کمر ہے شہ نے شہادت کے واسطے
اے مجرئ شفاعت امت کے واسطے

سر کاٹا اس جناب ہدایت مآب کا
بلوا کے گمرہوں نے ہدایت کے واسطے

کھانا اگر ہے زخم تو پانی ہے تیغ آب
مہمان کربلا کی ضیافت کے واسطے

زین العبادہ آبروئے دو جہاں کی ہے
دریتیم بحر امامت کے واسطے

جاتا ہے ہائے دھوپ میں پیاسا برہنا پا
کوئی نہیں ہے جائے اقامت کے واسطے

کرتے تھے آپ خنجر وشمشیر سے وضو
شبیر قتل گہہ میں عبادت کے واسطے

روح نبی وروح علی روح فاطمہ
تھی لاش شہ کے گرد حفاظت کے واسطے

شبیر سے یہ عرض کی حُر نے کہ یا امام
آیا ہے یہ غلام بھی خدمت کے واسطے

گر حکم ہو تو پہلے ہوں میں آپ پر فدا
حاضر ہے جان تک مری حضرت کے واسطے

کھو بیٹھے اپنا دولت ایمان ودیں لعین
دنیا میں چند روز کی ثروت کے واسطے

اے دل غم حسین میں شورابۂ سرشک
شربت ہے تشنگئ قیامت کے واسطے

رکھو ظفر پہ لطف وعنایت کی تم نظر
شاہا جناب شاہ ولایت کے واسطے

بھجن

یہ دنیا ہے اوگھٹ گھاٹی پگ نہ بہت پھیلاؤ جی
اتنے ہی پھیلاؤ کہ جس کے سکھ سے دکھ نہ پاؤ جی

اس دنیا کے جتنے دھندے سگرے گورکھ دھندے ہیں
ان کے پھندے جانہ پڑو تم ان میں نہ من الجھاؤ جی

یہ منوا ہے مورکھ لوبھی سب ہی پر للچاوے ہے
چاتر ہو تو اس مورکھ کو جیسے بنے سمجھاؤ جی

جس کارج کا ہونا کٹھن تم من میں اپنے جانتے ہو
اس کی دیا سے سہج وہ سمجھو اتنا نہ گھبراؤ جی

عمر اکارت تم نے کھوئی کچھ تو ادھر کا دھیان کرو
بہت گئی اور تھوڑی رہی ہے یہ بھی یونہی گنواؤ جی

سدھ بدھ دی کرتار نے تم کو سوچ سمجھ کر کرنا کچھ
ایسی کرنی مت کرنا جو کر کر پھر پچھتاؤ جی

کہیے نہ بھولا اس کو ظفر جو صبح کا بھولا سانجھ کو آئے
چھوڑ کے سگرے جھگڑے اپنا رب سے دھیان لگاؤ جی

دوہے

روندے تے روندے تے سوجھتا کچھ نہیں آنکھوں نال — تو نے تیری دیکھن دا بھول دا نہیں خیال
دل وچ تینڈی تیر نظر دے ایسے گہرے گھاؤ — بھر بھر مرہم مرہم جاواں تو بھی نہ ہو بھراؤ

سونگھوں جا کر باغ میں پھلون دی پاس — مینڈا باغ بہاروا سونہیں مینڈے پاس

گہری گہری کوک تھی پہلے مینڈے ساتھ — کن دوتا بہکادیا جودھر گئے کانن ہاتھ

ایک اشارے نال تسا دین کھل دے عقدے سارے — ڈھیل نہ کرائے فخر پیا سلطان نظام کے پیارے

پانی لگن سے پہلے اسنو دینو سب بھڑکائے — قاصد سوچکے پانی دیتا بگڑ بات بگڑ جائے

نا جانوں ان بھاگاں کیا باندھی مجھ سے لاگ — چاند سورج ہیں سبھی پھیر دے بھر دے ناہیں بھاگ

جن لوگاں ان انکھاں ڈیٹھا گیئے کہاں اے رام — وہ تو سانو نجر نہ اوندے کن کن کالوں نام

کس وا اپنا دھیان لگا ہے کوئی نہیں ہے پاس — رباں سائی سوچ وچ اپنی ٹوٹی جاندی آس

چینک اس دے دل وچ رہندے جیارے بے چین
چھٹیا کندی مکھ تو مینڈے بھر بھر امنڈے نین

ناحق ماری دھیان طبیباں آوندی سمجھ نہ آئے　　　عشق دا مینو روگ وہ جنو کوئی نہ پائے

اپنی اپنی لوگاں کہندے میندے نہ سزا دی بات　　　جو جو مجھ پر بیتے ہے سوموں سے کہی نہ جات

ایک ایک دھڑ کا اس جگ دا اور دوجے وہاں کا ڈر
جندری گھلائی ان دھڑکوں میں غم ہے جندرے پر

کوئی نہیں غم خوارا ساڈا اکھاں کس دی نال　　　شوق رنگ اپنے رب سوں کہیے جو ہے اپنا حال

جانے والے پھر نہ آئے انکھیاں تکدی راہ　　　دین رین میندا ہیا تڑپے زباں میری گواہ

جو میں لوگاں راتاں دہلی لی پی میندا نام　　　سارے نگری دی لوگاں تو ہو جاندی نیند حرام

لکھاں باری میں نے دکھائے اپنے دل کے گھاؤ　　　تیرا سونڑا بیدردی سے اب تک وہی سبھاؤ

سہدے سہدے ظلم تسادے پڑ گئے دل وچ چھید　　　پھر تو کس دن نال اکھاں اپنی میندے بھید

شوق رنگ اسنو میں نے یہ الکان اے جو آن　　　لگ جا ساڈے چھتیاں جانی بیکل میندی جان

انکھیاں میندی ڈھونڈھیں اسنو بیکل رہندی جان　　　نظر نہ آوندا سونڑا میند مینو اسدا دھیان

بھرا بھرا دل اوندا میندا بس نا سر نین چین　　　لے لے ہچکی رینا روئیں پھوٹ بہے مرے نین

سونڑا مینڈا مندر آواں مہر کرم دی نال   سوہی بنا کے انگناں بہاروں کھول کے سیس کے بال

کون اکھے اوسنو جا کر لوگاں مینڈا سندیس   چھاڈ کے مینو جیسے کے تم سونڑا جائے پردیس

روتے مینو بیتی اور لگدی گجری رتیاں   شوق رنگ اس کو کیونکہ نہ بھیجوں لکھ لکھ کر چیتیاں

دل میں رہے تو مینڈے سمایا اور نجر نہ آوے   سونڑا مینڈے دیکھن توں نت میرا دل للچاوے

سوچ سوچ کے من میں اپنے ناحق مورکھ روندا   ہونا تھا سو ہو ہی چکا اب روندے سے کا ہوندا

دعویٰ کر کر پیم دھرم کے باندھو پاپ کے پوٹ   مکھ سے گلاں پیار دی کردی دل وچ رکھدی کھوٹ

جی نہ دکھاؤ دیکھو کیدا تو یہ جان مسوس   کردی بھروسا کی دنیا کا یہ کانٹے کی اوس

کوئی کسد امیت نہیں سب اپنی غرض دے میت   شوق رنگ اچھا کینا ہم نے کی نہ کسی سے پیت

شوق رنگ اکھی جو کہ تسانو وہ ہی دیکھو کرنا   اس دے مکن دا انوکھا رستہ سمجھ سمجھ پگ دھرنا

قصیدہ نعتیہ

اے سرور دو کون شہنشاہ ذو الکرم
سرخیل مرسلین وشفاعت گرام

موکب ترا ملائک ومرکب ترا براق
مولد ہے تیرا مکہ ومعبد ترا حرم

رنگ ظہور سے ترے گلشن رخ حدوث
نور وجود سے ترے روشن دل قدم

ہوتا کبھی نہ قالب آدم میں نفخ روح
بھرتا اگر خدانہ محبت کا تیری دم

کرتا تھا جس سے مردہ کو زندہ دم مسیح
تھا شمسہ تیرے خلق کا وہ اے نکوشیم

ٹوٹا جو کفر قوت اسلام سے ترے
صد جائے سے شکستہ ہے زنار موج یم

تو تھا سریر اوج رسالت پہ جلوہ گر
آدم جہاں ہنوز پس پردۂ عدم

کرتا ہے تیرے اسم مبارک کو دل پہ نقش
اس واسطے عزیز جہاں ہوگیا درم

اے معدن کرم تری ہمت کے واسطے
کمتر ہے سنگریزہ سے قدر نگینِ جم

جو کچھ سوائے عرش وہ سب اس کے سایہ میں
تیرے ہوا ہے جاہ کا برپا جہاں علم

صدقے زمیں کے ہوتا نہ پھر پھر کے آسماں
رکھتا سر زمیں نہ اگر اپنا تو قدم

محروم تیرے دست مبارک سے رہ گیا
کیوں کر نہ چاک اپنا گریباں کرے قلم

عالم کو تیرا نور ہوا باعث ظہور
آدم ترے ظہور سے ہے مظہر اتم

ہیں زائرین روضۂ اقدس ترے جہاں
آتا ہے پائے بوس کو واں روضۂ ارم

واللیل تیرے گیسوئے مشکیں کی ہے ثنا
والشمس ہے ترے رخ پر نور کی قسم

انصاف تیرا دیوے جو دادستم کشاں
دندان سین ارّہ کشاں ہو سر ستم

قرآں میں جب کہ خود ہو ثنا خواں ترا خدا
کیا تاب پھر قلم کو جو کچھ کرسکے رقم

تیری جناب پاک میں ہے یہ ظفر کی عرض
صدقے سے اپنے آل کے اے شاہ محتشم

صیقل سے اپنے لطف وعنایت کے دور کر
آئینہ ضمیر سے میرے غبار غم

پہنچا نہ آستان مقدس کو تیرے میں
اس غم سے مثل چشمہ ہوئی میری چشم نم

پر خاک آستاں کو تری اپنی چشم میں
کرتا ہوں سرمہ میل تصور سے دمبدم

پنکھا

نہیں مستوجب تعظیم وزیارت پنکھا جو کہیں اہل شریعت کہ ہے بدعت پنکھا
اک تماشا ہے اسے کہتی ہے خلقت پنکھا رکھتی ہے گرمیٔ ہنگامۂ عشرت پنکھا
آتش شوق کو ہے موجب شدت پنکھا

نورِ الطاف کرم کی ہے یہ سب اس کی جھلک کہ وہ ظاہر ہے ملک اور ہے باطن میں ملک
اس تماشے کی نہ کیوں دھوم ہو افلاک تلک آفتابی سے خجل جس کی ہے خورشید تلک
یہ بنا اس شہ اکبر کی بدولت پنکھا

شائق اس سیر کے سب آج ہیں با دیدۂ دل واقعی سیر ہے یہ دیکھنے ہی کے قابل
چشم انجم نہ ہو اس سیر پہ کیوں کر مائل سیر یہ دیکھے ہے وہ بیگم والا منزل
جس کے ایواں کا رکھے ماہ سے نسبت پنکھا

رنگ کا جوش ہے ماہی سے زبس ماہ تلک ڈوبے ہیں رنگ میں مدہوش سے آگاہ تلک
آج رنگین ہیں رعیت سے لگا شاہ تلک زعفراں زار ہے اس باغ سے درگاہ تلک
دیکھنے آئی ہے اس رنگ سے خلقت پنکھا

عشرت عیش کا ہے باغ میں انبوہ عجب عرق شبنم گل ٹپکے ہے گرمی کے سبب
بے طلب غنچہ نہیں ناز سے کھولے ہوئے لب شاہدان چمن اس دم ہیں جو سرگرم طلب
دہن باد سے چاہیں ہیں یہ منت پنکھا

غنچہ پوچھے ہے صبا سے کہ بتادے کیا ہے   چشم کیوں شوق میں نرگس کی ہمیشہ وا ہے
کیا تماشہ ہے کسے دیکھا ہے کیا دیکھا ہے   سایہ برگ سے گل باغ میں یہ کہتا ہے
وقف نظارہ مرے منھ پر لگا مت پنکھا

ہر سحر شوق میں کیا وجد کرے ہے اپنے   دیکھتا برگ جو شاداب تری ہے اپنے
ہاتھ پر گل در شبنم جو دھرے ہے اپنے   جوش فوراہ سے دامن جو بھرے ہے اپنے
گو ہر قطرۂ نیان لطافت پنکھا

آگے بھی ہمدم دوساز سے سنتے ہی سدا   بعضی آواز سے ہل جائے ہے دل انساں کا
وہ بجا کہتے ہیں یہ بات کہ ہم نے دیکھا   ہر نکورے پہ ہے پنکھے کی طرح دل ہلتا
آج نوبت سی لگا کرنے یہ نوبت پنکھا

حرکتیں دیکھ کے پنکھے کی کہیں اہل خرد   کہ وہ ہے غم کی طرف مارو ہا دستِ رد
لیک میں نے اس اشارے سے یہ پایا مقصد   ہے تماشائیوں کو اپنے بلاتا شاید
دست جناں کی جو رکھتا ہے شباہت پنکھا

چشم نم کو جو وہاں بہر تماشا جائے   جام صہبا کی طرح سخت ہنسی آجائے
کیونکہ جوں شیشۂ ہستی سے نہ دم اکتا جائے   عیش عشرت کا ہے یہ شوق کہ گھبرا جائے
کر جھلے دل پہ زشش وقت حرارت پنکھا

مرد و زن شاہ وگدا کو دک وپیرو دانا   جو ہواخواہ ہیں پنکھے کے ہیں وہ سب یکجا
ہر طرف شور سا ہے اور یہی ہے غوغا   کی ہے ہنگامہ عشرت نے قیامت برپا
ایک نیزے پہ ہے خورشید قیامت پنکھا

دیکھ کر آئینہ پنکھے میں یہ سوجھی ہے مثال   مہ وخورشید بغل گیر ہیں ہنگام وصال

لیک صناع کی ہے اور یہ صنعت کا کمال اس میں جوں ابروئے مہ رو جو بنایا ہے ہلال
ہے مہ عید صفت موجب شہرت پنکھا

خوشنمائی میں تماشا یہ کوئی پنکھا ہے طرفہ و نادر و زینت وہ زیب افزا ہے
زیور حسن پری چہرۂ و مہ سیما ہے شاہد عیش کے ماتھے پہ بھلا لکھا ہے
ہے طلا کار جو مینے کی صورت پنکھا

جو کہ خواہان مئے عیش ہیں ان سے کہہ دو تم کو منظور اگر یہ ہے کہ کیفیت ہو
دو تم آراستگی بزم مئے الفت کو نہیں آویزہ کہ طاقوں میں چنے ہیں دیکھو
لے کے مینائے دل اہل محبت پنکھا

سیر وحدت ہے اگر دیکھیے پنکھے کا جلوس یعنی یکرنگ ہیں سب باعث رنگین ملبوس
کیوں نہ پنکھے سے دل طاعتیان ہو مانوس الٹا لٹکا ہے یہ پڑھنے کو نماز معکوس
کوئی عابد ہے بڑا اہل ریاضت پنکھا

کون اس پنکھے سے روکش ہو یہ ہے تاب کسے مہر جب دیکھ کے پیشانی عجز اپنی گھسے
سربلندی ہوئی اس واسطے عالم میں اسے اس کی درگاہ میں پنکھا یہ چڑھے ہے جیسے
قصر جنت میں اگر حور ہے جنت پنکھا

دل گرفتوں کا یہاں کیوں نہ ہو تفریح مزاج یہ تماشا مرض غم کا مجرب ہے علاج
ہر طرف عیش کا سامان ہے عشرت کا رواج اے ظفر خاطر یاراں کا ہوا خواہ کو آج
فرحت افزا ہے دم گرمیٔ صحبت پنکھا

غزلیات فارسی

دربتان خود نما زاہد خدارا دیدہ ام
آنکہ از چشم تو پنہاں آشکارا دیدہ ام

تانظر افگندہ ام برقامت رعنائے تو
جملہ از سر تا قدم نازو ادا را دیدہ ام

کردہ ام رنگین زحسرت پنجۂ مژگاں نجوں
تابدستت سرخئ رنگ حنا را دیدہ ام

سالہا گردیدہ ام من در تلاش کیمیا
دیدہ ام اکسیر اگر آں خاک پارادیدہ ام

ناصحا طرزِ نگاہش رانمی دانی کہ چیست
پُرس از من ماجرا من ایں بلا را دیدہ ام

کردہ ام من عمر خوددر تیرہ روزی ہابسر
گر شبے در خواب آں زلف دوتارا دیدہ ام

چوں تو در عالم ندیدم مکشے صوفی وشے
اے ظفر بسیار رندو پارسا را دیدہ ام

بتے سرکشے کافرے کج کلا ہے
بحسن آفتابے بہ رخسار ما ہے

معطر کن مغز جان دو عالم
بہ عنبر فشانی زلف سیا ہے

مسخر بیک غمزہ سازو جہاں را
کند چوں زمژگاں صفِ آرا سپا ہے

بہر گام در راہ مہرو محبت
دو دیدہ بہ دنبال او داد خوا ہے

نہ در خاکساری چو من بینوائے
نہ در نازو تمکیں چو اوبادشا ہے

برم تحفۂ پیش او از کجا من
نہ در دیدہ اشکے نہ در سینہ آ ہے

فگند از سر لطف آں شاہ خوباں
ظفر برمن بے بضاعت نگا ہے

اے بت طناز قربانت شوم — اے سراپاناز قربانت شوم
حلقۂ زلفت وکمند جان ودل — اے کمند انداز قربانت شوم
چوں مسیحا در لب جاں بخش تو — صد ہزار اعجاز قربانت شوم
تا بہ قربانگاہ من یک رہ زناز — باز آتا باز قربانت شوم
تو بہر انداز بنما جلوۂ — من بہر انداز قربانت شوم

ہر دم آں ابرو کماں را از ظفر
می رسد آواز قربانت شوم

نیست از انجم شب تاب چراغاں امشب — مگر از خندہ نمایاں شدہ دندان امشب
شب ہم از کاکل مشکیں تو سودا دارد — کہ شد از کاہکشاں چاک گریباں امشب
دل نہ شوق رخ وزلف تو چناں گشت غریب — کہ زساماں سحر ماندونہ ساماں امشب
زلف شب رنگ برخسار تو پیچید ہر روز — صبح عشاق سیہ بخت بداماں امشب

صبح ہجرش ظفر آورد بلا روز سیاہ
بود در منزل آں ماہ کہ مہماں امشب

اینکہ بینی ہمہ ہا قالب وجاں ہمہ اوست — بلکہ ہم قالب وہم روح درداں ہمہ اوست
انچہ بیرون ودرون است ہمانست ہماں — راز فاش ہمہ او سرِ نہاں ہمہ اوست
درپس پردہ وبے پردہ در آید از دل — بے نشان وسبب ونام ونشاں ہمہ اوست
نیست دیروحرم از شیخ وبرہمن آباد — ہمہ مہماں دمکینے بہ مکاں ہمہ اوست
اے دل آں گوہر یکتا کہ نیر زوبدوکون — چشم بکشا دوبمین زیب دکاں ہمہ اوست

شعلۂ نار جحیم وگلِ گلزار نعیم یک تجلی ست کہ در جلوۂ شاں ہمہ اوست

میز ندائے ظفر امروز بباغ توحید

ہمچو بلبل دل شوریدہ فغاں ہمہ اوست

گل فشاں آمدست ابر بہار نغمہ بنیاد کرد بلبل زار

طرہ بکشاد سنبل وریحاں چشم واکرد نرگس بیمار

بر سر سبزہ قطرۂ شبنم ناز ابریشم ودر شہوار

گل نہاد است جام مے برکف غنچہ دارد صراحیٔ بکنار

اے ظفر جام بادہ از سرگیر

دور عیش است عہد بوس وکنار

دکھی کی پکار

اس ذیل میں بہادر شاہ ظفر کا وہ کلام درج کیا جاتا ہے جو کلیات میں شامل نہیں ہے اور اس میں سے اکثر و بیشتر قیام رنگون کی یادگار ہے یہ نغمات اسیری زخم دل سے لہولہان ہیں۔ ''ہولی'' سید آصف علی مرحوم کی دریافت ہے اور رسالہ ''آج کل'' میں شائع ہو چکی ہے۔ دوسری چیزوں کے فراہم کرنے میں ہم نے جن ماخذوں سے استفادہ کیا ہے ان کی فہرست یہ ہے:

واقعات دار الحکومت دہلی	مولوی بشیر الدین احمد	
طامس مٹکاف کی ڈائری	مرتبہ خواجہ حسن نظامی	
چمن بے نظیر	مولفہ منشی محمد ابراہیم، مطبع نولکشور	
مجموعۂ عشاق	مرتضائی پریس آگرہ،	ذخیرہ مولانا احسن مارہروی مرحوم
پھولوں کا ہار	مطبع ابوالعلائی آگرہ،	ذخیرہ مولانا احسن مارہروی مرحوم
بزم عشرت	(دی انڈین سونگ بک) مرتبہ کنور اندر سہائے ورما کنہیالال اسٹیم پریس آگرہ،	ذخیرہ مولانا احسن مارہروی مرحوم
بہار دلکش	مطبع گلزار محمدی، لکھنؤ،	ذخیرہ مولانا احسن مارہروی مرحوم
نغمہ عشاق	نامی پریس لکھنؤ، ۱۸۸۶،	ذخیرہ مولانا احسن مارہروی مرحوم
نسیم چمن	مرتبہ محمد یوسف علی طپش، مطبع باقری بمبئی ۱۹۰۲،	" " "
نغمہ دلربا	مرتبہ بیجناتھ رسوا و جوالا پرشاد شیدا، احسن المطابع لکھنؤ،	" " "
اوج سخن	مرتبہ محمد فاضل مطبع تیغ بہادر لکھنؤ، ۱۹۱۸،	ذخیرہ مولانا احسن مارہروی مرحوم
مجموعۂ قانون راگ معروف بہ نغمۂ طرب	مطبع گلزار محمدی لکھنؤ،	ذخیرہ سر شاہ سلیمان مرحوم
دفتر راگ	مرتبہ عبداللہ خاں عظمت مطبع سعیدی لکھنؤ،	" " " "
عطر قوالی	مرتبہ نوح ناروی، اصح المطابع کانپور، ۱۹۲۳	" " "
نو بہار رنگون	مرتبہ طاہر نگینوی اصح المطابع لکھنؤ	" "

گلزارِ سخن	مرتبہ ولیم جیکب صاحب مطبع شگوفہ گلزار اودھ، لکھنؤ۔	"	"	"
غنچۂ راگ	مطبع افتخار علی ۱۸۹۶ء	"	"	"
رہبرِ گراموفون	مطبع مصطفائی، کلکتہ، ۱۹۱۰	"	"	"

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں
مرا رنگ روپ بگڑ گیا، مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصل بہار ہوں
نہ تو میں کسی کا حبیب ہوں نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آکے شمع جلائے کیوں میں وہ بیکسی کا مزار ہوں
میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا، مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تبہ ہوئی، کہوں کیا کیا ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ بھی قابل دار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لوگوں کو بے گنہ
وے کلمہ گویوں کس سمت سے ابھی دل میں ان کے بخار ہے
نہ تھا شہر دہلی، تھا اک چمن کہوں کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے

یہی تنگ حال جو سب کا ہے یہ کرشمہ قدرت رب کا ہے
جو بہار تھی سو خزاں ہوئی جو خزاں تھی اب وہ بہار ہے

شب و روز پھول میں جو تلے، کہو خارِ غم کو وہ کیا سہے
ملے طوق قید میں جب انھیں کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے

نہ دبایا زیرِ چمن انھیں نہ دیا کسی نے کفن انھیں
نہ ہوا نصیب وطن انھیں نہ کہیں نشان مزار ہے

سبھی جا وہ ماتم سخت ہے کہوں کیسی گردش بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے

جو سلوک کرتے تھے اور سے وہ ہیں دیکھو کون سے طور سے
وہیں تنگ چرخ کے جور سے رہا تن پہ ان کے نہ تار ہے

یہ وبال سر پہ ہے تن مرا، نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
کٹے غم ہی نکلے جو دم مرا، مجھے اپنی زندگی بار ہے

کیا ہے غم ظفر تجھے حشر کا، جو خدا نے چاہا تو برملا
ہمیں ہے وسیلہ رسول کا، وہ ہمارا حامیٔ کار ہے[1]

مرغ دل مت رو یہاں آنسو بہانا منع ہے
اس قفس کے قیدیوں کو آب و دانا منع ہے

تیری ہی دیوار سے اب ہم تو سر ٹپکا کیے
روزن دیوار تک آنکھیں ملانا منع ہے

قتل کر کے مجھ کو اب سنگیں دلوں نے یہ کہا
قتل ہو جانا ولیکن تڑپھڑانا منع ہے

مت تڑپیو دیکھنا خنجر تلے اے صید دل
عشق کے مقتل میں دست و پا ہلانا منع ہے

اے ظفر تم کو ہمیشہ چاہیے حسرت مدام
اب تمھیں چالیس دن مہندی لگانا منع ہے

---

[1] بعض مجموعوں میں یہ شعر اس طرح درج ہے:

تجھے خوف حشر کا کیا ظفر تو خدا سے جا ملا سر بسر
تجھے ہے وسیلہ رسول کا وہ جو تیرا حامیٔ کار ہے

لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں
عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
کہہ دو یہ حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں اتنی جگہ کہاں ہے دل داغدار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

جا کہیو ان سے نسیم سحر مرا چین گیا مری نیند گئی
تمھیں میری نہ مجھ کو تمہاری خبر مرا چین گیا مری نیند گئی

اے بادشہ خوبان جہاں تری موہنی صورت کے قرباں
کہا اس نے پڑی تری جس پہ نظر مرا چین گیا مری نیند گئی

ہوئی باد بہاری چمن میں عیاں گل و بوٹا پہ باقی رہی نہ خزاں
مری شاخ امید نہ لائی ثمر مرا چین گیا مری نیند گئی

نہ حرم میں تمہارا ہے یار پتہ، نہ سراغ دیر میں ہے ملتا
کہاں جا کے دیکھوں میں، جاؤں کدھر مرا چین گیا میری نیند گئی

اے برق تجلی بہر خدا، نہ جلا مجھے ہجر میں شمع آسا
مری زیست ہے مثل چراغ سحر مرا چین گیا مری نیند گئی

یہی کہتا تھا رو رو کے آج ظفر مری آہ رسا میں ہوا نہ اثر
تری ہجر میں موت نہ آئی مگر مرا چین گیا مری نیند گئی

کبھی بن سنور کے جو آ گئے تو بہار حسن دکھا گئے
مرے دل کو داغ لگا گئے وہ نیا شگوفہ کھلا گئے

کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیوں کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

مرے پاس آتے تھے دمبدم، وہ جدا نہ ہوتے تھے ایک دم
یہ دکھایا چرخ نے کیا ستم کہ مجھی سے آنکھیں چرا گئے
جو ملاتے تھے مرے منہ سے منہ کبھی لب سے لب کبھی دل سے دل
جو غرور تھا وہ انھیں پہ تھا وہ سبھی غروروں کو ڈھا گئے
بندھے کیوں نہ آنسوؤں کی جھڑی کہ یہ حسرت ان کے گلے پڑی
وہ جو کاکلیں تھیں بڑی بڑی وہ انھیں کے پیچ میں آگئے
یہی شوق تھا ہمیں دمبدم کہ بہار دیکھیں گے اب کے ہم
جوں ہی چھوٹے قید قفس سے ہم تو سنا خزاں کے دن آگئے

نہ غنچہ ہے نہ سنبل ہے پڑا ہے باغ ویرانہ — نہ گل ہے اور نہ بلبل ہے نہ ساقی ہے نہ پیمانا
ذرا اے جان تم ٹھہرو ہمارے پاس بھی دم بھر — دل بیتاب تو ٹھہرے، چلے جانا، چلے جانا
چھکایا ایک پیالے میں مجھے تو نے قیامت تک — سلامت تو رہے ساقی رہے قائم یہ میخانا
محبت میں تری اے گل نہ جانے کیا ہوا ہم کو — نہ خوش آتا چمن ہم کو نہ خوش آتا ہے ویرانا
نکل جائے اگر دم بھی اسی گل کے تصور میں
پس دیوار گلشن اے ظفر اب ہم کو دفنانا

خار حسرت قبر تک دل میں کھٹکتا جائے گا — مرغ بسمل کی طرح لاشہ پھڑکتا جائے گا
میں وہ کشتہ ہوں کہ میری لاش پر اے دوستو — اک زمانہ دیدۂ حسرت سے تکتا جائے گا
اے ظفر قائم رہے گی جب تلک اقلیم ہند
اختر اقبال، اس گل کا چمکتا جائے گا

میں ہوں نحیف و ناتواں دور ہے یار کی گلی — اس کی ہوائے وصل پر مجھ کو اڑا کے لے چلی
حال عدم نہ کچھ کھلا گزری ہے رفتگاں پہ کیا — کوئی حقیقت آن کر کہتا نہیں بُری بھلی

کل سے وہ غنچہ لب مرا مجھ سے جدا جو ہو گیا　　جان کو اضطراب ہے دل کو مرے ہے بے کلی

تیرا ظفر یہ تا کجا رنج والم میں مبتلا

تری مدد شتاب ہو وقت مدد ہے یا علی

واہ کیا طرزِ ستم تجھ کو ستم گر یاد ہے　　اک جہاں تیرے ستم سے کر رہا فریاد ہے

کھیلتا ہے تو جو اس مارِ سیاہِ زلف سے　　کیا تجھے اے دل کوئی کالے کا منتر یاد ہے

جب سنی تجھ سے شکایت بیقراری کی سنی　　بات تجھ کو ایک ہی اے قلب مضطر یاد ہے

ذبح کرنے کا مرے ڈھب خنجر بیداد سے　　اس بت کافر کو کیا اللہ اکبر یاد ہے

اے ظفر پڑھتا ہے خط میرا وہ اس عنوان سے

غیر کو سرتا بہ پا مضمون سن کر یاد ہے

بہکانے والے آپ کے سب یار بن گئے　　سمجھانے والے مفت گنہگار بن گئے

میں نے دیا تھا دل انھیں دلدار جان کر　　وہ میرے دل کو لے کے دل آزار بن گئے

اس گل بغیر رات بھر آئی نہ مجھ کو نیند　　بستر کے تار حق میں مرے خار بن گئے

بھیجا تھا میں نے اپنی طرف سے انھیں وہاں　　وہ بھی تو جا کے ان کے طرفدار بن گئے

ہشیار رہیو ایسے تو یاروں سے اے ظفر

یہ یار اس زمانے کے اغیار بن گئے

تقدیر میری ان دنوں کیسی بدل گئی　　ہاتھوں میں وہ پری مرے آ کر نکل گئی

ابرو جو ہل گئے تھے کسی روز یار کے　　لاکھوں سپاہ کٹ گئی تلوار چل گئی

شعلہ ہماری آہ کا ایسا ہوا بلند　　بجلی تڑپ کے چرخ کہن سے نکل گئی

اے وائے انقلاب زمانہ کے جور سے

دہلی ظفر کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی

مجھ کو مت روکو مجھے یار کے گھر جانے دو مثل پروانہ مجھے شمع پہ جل جانے دو
نیم بسمل مجھے کیوں چھوڑے چلے جاتے ہو اپنے عاشق کا ذرا دم تو نکل جانے دو
ایک شب وصل سے ہم یار کے محروم رہے آج کی شب تو یہ ارمان نکل جانے دو
پائے بوسی بھی تمھیں یار کی ہووے گی ظفر
اس کے کوچے کی ذرا خاک تو مل جانے دو

پس مرگ مرے مزار پر جو دیا کسی نے جلادیا
اسے آہ دامن باد نے سر شام ہی بجھا دیا
مجھے دفن کر چکو جس گھڑی تو یہ اس سے کہیو کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشق زار تھا تہ خاک اس کو دبا دیا

ابھی آنکھ جھپکی تھی ایک پل کہا مجھ سے جی نے کہ اٹھ کے چل
دل بیقرار نے آٹھ پہر مجھے چٹکی لے کے جگا دیا
نہ تو تاب ہے تن زار میں نہ قرار ہے غم یار میں
مجھے سوز عشق نے آخرش یونہی مثل شمع گھلا دیا
کہا نامہ بر نے جواب دو خط شوق عاشق زار کا
وہیں خط کو آگ میں ڈال کر کہا کہیو خط کو جلا دیا
کہا آنے نہ دیجئے غیر کو کہا ہم بلائیں گے شوق سے
تمھیں رشک ہو تو نہ آؤ تم یہی کہہ کے ہم کو اٹھا دیا
پس مرگ قبر پہ اے ظفر کوئی فاتحہ بھی پڑے کہاں
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اسے ٹھوکروں سے اڑا دیا

ہولی

ہند میں کیسو پھاگ مچوری
جورا جوری

پھول کا تختہ ہند بنا تھا
کیسر کی سی کیاری
کیسو پھوٹے بھاگ ہمارے
لٹ گئی باگ بہاری
لٹ گئی سب پھلواری

گولن کے گلال بنایو
توپن کی پچکاری
آئے رہی سگری مکھ پر
ایسی تک تک ماری
شور دنیا میں مچوری

گنگا رام یہودی نے
تخت کا ناس کیوری
اور کو وَ نے کا ہے
ایسا پاپ کیوری
سراپ سب کا لیوری

بہادر شاہ درگاجی مرد نے
دین کا ساتھ دئیوری
مرتے دم تک اس پریمی نے
دین ہی دین کیوری
نام اس رب کا لیوری

ہند میں کیسی پھاگ مچوری
جورا جوری

خیال

کہو جی اب ہم کس کے باتن پر لاویں گیان دھیان
اب میں ٹھہری کچھ اور ہی
اور نین کہے اور ہی
پگ چلت ہے اورچال
کچھ کی کچھ سنیں کان سمجھایا لاکھ بار

اک کی اک سے نہ ملت ہے
شوق رنگ وہی مثل ہے ایک انار سو بیمار
ایک مکان سو مہمان

بھجن

کون نگر میں آئے ہیں ہم کون نگر کے باسے ہیں
جائیں گے اب کون نگر کو من میں ایسے ہراسے ہیں
کیسا ملک ہے کیسا رویہ، کیسی چال اور کیسی ڈھال
یا ہی من اندیشے میں اور یا ہی جی کو ساسے ہیں
دیس نیا ہے، بھیس نیا ہے، رنگ نیا ہے ڈھنگ نیا
کون آنند کرے ہیں واں اور رہتے کون اداسے ہیں
کیا کیا پہلو دیکھے ہیں، ہم نے اس پھلواری میں
اب جو پھولے پھول یہاں کچھ اور ہی اس میں باسے ہیں
پود بندھی سب ہے یاں کی واں کی ہے کچھ اور ہوا
کوئی جتادے یہ ان کو جو لڑتے لوگ ہواسے ہیں
دنیا ہے یہ رین بسیرا بیت گئی رہی تھوڑی سی
ان سے کہہ دو سونہ جاویں نیند میں جو کہ نداسے ہیں

قطعہ

مصیبت کو سنے آکر ظفر کی　　　کہاں طاقت ہے ایسی ہر بشر کی
یہودی احسن اللہ اس لعیں نے　　　حلف جھوٹے لیے لالچ میں زر کی

قطعہ تاریخ وفات شہزادہ دارا بخت ولی عہد

آہ ولی عہدے کہ دارا بخت بود
کرو چوں رحلت ازیں دنیائے دوں
شد درون خلق داغ از سوزِ غم
گشت سال رحلتش "داغ دروں"
۱۲۵۶ھ

قطعہ تاریخ وفات شیخ محمد ابراہیم ذوق

(۱)

شب چار شنبہ بماہ صفر
بحکم خداوند جاں داد ذوق
ظفر روئے اردو بناخن زغم
خراشید وفرمود استاد ذوق

۱۲۷۱ھ

(۲)

طوطیٔ ہند حضرت استاد ذوق نے
لی گلشن جہاں سے جو باغ جناں کی راہ
سال وفات جو کوئی پوچھے تو اے ظفر
کہہ ذوق جنتی ز سر بخشش الہ [۱]

۱۲۷۱ھ

---

[۱] یہ قطعہ ذوق کی لوح مزار پر کندہ ہے۔

برسات کے گیت

(۱)

گھر آئے بادر کارے چھپ گئے تارے
پیہو پیہو پپہا پکارے گھر آئے بادر کارے
کوئل کوکے گھنی امبریاں اَت برکھا میں پھلرنگ سیّاں
ہرے ہرے بن میں مرلا جھنکارے گھر آئے بادر کارے

(۲)

میں جھیلی رات کاری پیا بن لاگے بوند کٹاری
پیابن لاگے رین بھاری میں جھیلی رات کاری
ایک تو میں اکیلی دوڑوں دوجے ٹھنڈے سانس بھروں
شوق رنگ کہندی کہندی میں باری
پیابن لاگے بوند کٹاری

یہ تمام گیت بہادر شاہ بادشاہ دہلی نے (قطب صاحب میں) جھرنے پر بیٹھے بیٹھے اپنی بہو مرزا بلاقی کی بیگم پر جن کے میاں ان دنوں کہیں باہر تشریف لے گئے تھے بنایا تھا۔ سید احمد دہلوی (ہادی النساء، ص:۱۵۱)

(۳)

کارے کارے بدروا کاری کاری رین — کہیں دیوا بالن کو جاؤں گی میں
راہ نہ جانوں گلیاں نہ جانوں — 'شوق رنگ' پیا بن جیرا بے چین
کارے کارے بدروا، کاری رین — چندا توری چاندی اور نجر نہ آوے کو
سیاں کو ڈھونڈت مورے نین — کارے کارے بدروا کاری کاری رین

(۴)

رین سے کل نا ہیں پڑے ، دلئ مارا بولے مورا
مورے پچھواڑے مرلا جگت ہے کوئی مت مارو روڑا
دلئ مارا بولے مورا
روڑے کا مارا مرجائے گا مورا مجھ برہمن کا جوڑا
ان مت مارو روڑا، دلئ مارا بولے مورا
میں اپنے مورا کو کڑے گھڑا دوں
گل سونے دا توڑا دلئ مارا بولے مورا
دلئ مارا بولے مورا

(۵)

موہے جھولا ڈلا دو مہاراج امو ا کی چھیاں تلے
ہم تم مل کر پینگ جڑھادیں 'شوق رنگ' مہارا سرتاج
امو ا کی چھیاں تلے

(۶)

جھولا کن نے ڈالا ہے امریاں
چار گئی تھیں بھول بھلیاں
بھولی بھولی ڈولیں: پھلرنگ سیاں
جھولا کن نے ڈالا ہے امریاں
رین اندھیری تال کنارے مرلا جھنکا رے
بادل کارے برسن لاگیں بوندیں پھیاں پھیاں
جھولا کن نے ڈالا ہے امریاں

(۷)

اب موہے چندری کون رنگا وے
پیا ہوتے تو میں کھم گڑاتی
سیاں ہوتے تو ڈوری منگاتی
'شوق رنگ' اب مجھے چندری رنگاوے
کہو جھولا جھولوں میں کس رنگ
کہو پاک جوڑوں میں کس سنگ
میری برہا جلائی امنگ
میرے پیا کو کون بلاوے

(۸)

سکھی آئے بدروا جھوم کے مجھے رین اندھیری کاریاں
سب سکھیاں مسل پنچیاں پیا میں رہی لاج کی ماریاں
سکھی آئے بدروا جھوم کے

میری ساس نے دی ہیں گاریاں میری نند ہٹیلی بالیاں
کالی کوئل بھی بولے بولیاں مجھے رین اندھیری کاریاں
سکھی آئے بدروا جھوم کے

میری پیا بن سیجیں سونیاں میرے سر پر گاگر بھاریاں
میں تو درشن پی کے باریاں مجھے رین اندھیری کاریاں
سکھی آئے بدروا جھوم کے